URDU

Date 5-12-09

[illegible] SHIFA KHANA.

[illegible] – Mulla Kumaoji.

[illegible] – Barqi Press (Delhi).

[illegible] — Not Available

[illegible] – [illegible]?

[illegible] — [illegible]

اللہ شافی

شفاخانہ

اسمِ احسن

مجموعہ ہفتم

از

ملا رموزی

بہار اردو ۱۳۳۲

بے حد مسرت کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے کہ ''بہار اردو''
ایک ماہوار رسالہ حضرت مُلّا رموزی کی ایڈیٹری میں جاری ہو رہا
مختصر تعریف یہ ہے کہ جس مُلّا رموزی کے قلم نے پندرہ برس تک اخبا
اور رسائل اردو میں اپنی خداداد شگفتہ نگاری اور وجد آفریں مضمو
لاکھوں بہاریں پیدا کیں وہ خود اپنے ذاتی رسالہ کی سطر سطر کو
اور لاجواب بنائیگا۔ چنانچہ اس رسالہ کا پہلا مقالہ ''تاجی جو''
صاحب نے لکھا ہے اس کی شوخی ظرافت اور قیامت کی نکتہ چینی اور نکتہ
زبان اردو جتنا فخر کرے کم ہے اس مقالہ اولین کا عنوان ہے ''اعوذ باللہ''
اس اعوذ باللہ میں جو کچھ لکھا ہے بس پڑھنے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے
اور اسکے سوا ''مشاعرہ'' کے عنوان سے غزلوں پر جو تنقیدیں ہیں گویا وجد
شرارتیں ہیں جو اس رسالے کے صفحات پر لنڈھائی گئی ہیں پھر گلابی اردو
مضمون ہے جسکی اچھوتی انشا مسلم ہے پھر حضرت مولانا ظفر علیخاں مالک
زمیندار کی ظرافت کا نمونہ ہے غرض رسالہ کیا ہوگا گشت زعفران ہوگا
چندہ صرف ے ششماہی جاری نہ ہوگا فی پرچہ ۴ر علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ مُلّا رموزی۔ بھوپال

انتساب

ادبیات وطن بالخصوص زبان اردو کی عروج و بقا کے لئے آج معارف پرور
ب جو کچھ کر رہا ہے وہ وطنی حکومت ہونے کے باعث اوتنا ہی ہے جو شاہان مغل
ہت ادبیات فارسی کے لئے اپنی شاہانہ مقدرتوں سے کر گزرے ہیں۔

ردو کے لئے پنجاب کے اس جذبۂ عمل میں جو چیز سب سے زیادہ قابل احترام
ستائش ہے وہ امراء پنجاب و رؤساء پنجاب کا اُردو سے کمال شغف اور اوسکی
پرستی کرنا ہے جو دوسرے صوبوں کے امراء و رؤساء کیلئے معلوم نہیں
ہانتک سبق آموز ہے۔

پس رئیس محترم عزت مستطاب عالی جناب خان بہادر آنریبل
نواب احمد یار خاں بہادر ایم۔ ایل۔ سی پنجاب رئیس لڈن ضلع ملتان
پنجاب کے اونھی گرامی مرتبہ علم نواز رؤساء سے ہیں جن کے اسماء گرامی کتب
اردو میں اوسی طرح یادگار اور زندہ رہیں گے جس طرح صدیاں گزرجانے پر بھی
سلاطین مغل کے نام کتب فارسی میں زندہ و محفوظ ہیں پس ممدوح معلے
جناب کی ایسی ہی ادب نواز توجہات اور احسانات کی یادگار کے طور پر
اپنے اس شفا بخش مجموعۂ مضامین کو آپ کے نام نامی سے انتساب کی
عزت دیتا ہوں۔

ملا رموزی

۱

مقدمہ

(بقلم خود)

اوس حکیم وشافی مطلق کے نام سے جس کی فرماں برداری ہی سے ساری
ئی کی فرماں روائی ملتی ہے جسکی غلامی اختیار کرنے ہی سے دنیا جہان کی
دی نصیب ہوتی ہے،

اوس خدا کے نام سے جس نے اپنے آخری رسول احمد مصطفےٰ صلی اللہ
سلم کو اس لئے بھیجا کہ وہ ساری دنیا کو بتا دیں کہ عبادت وعبودیت صرف
لے لئے ہے اور انسان انسان کی غلامی، ماتحتی، محکومی، اور نمک خواری
نت سے فطرۃً آزاد ہے۔

اوس خدا کے نام سے جس نے اس آسمان جاہ نبی کے گرامی جناب خاندان
فرد کو یہ برتر از قیاس وگمان مقدرت عطا فرمائی کہ وہ تبلیغ حق۔ اور
خیال کی آزادی کی خاطر کوفے اور کربلا کی بلا خیز فوجوں سے جا ٹکرایا
دل وبے حوصلہ نہوا،

وس خدا کے نام سے جس نے خلفاء راشدین کو اپنی اطاعت وفرماں
کے صدقے اور تعلیماتِ اسلامی کی لفظ بلفظ پیروی کے باعث تاجداران

عالم کے زمرۂ اول میں جگہ دی، اور جنگی جہاں بانی وجہانداری میں انسانیت نے آزادی کی دولت پائی، رضوان اللہ علیہم اجمعین،

کہنے کو یہ زمانۂ تعلیم وترقی کا وہ آخری زمانہ ہے جس کے بعد شاید ہی اس سے زیادہ بلند زمانہ آئے، یعنی جب علم وفن کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچانے کے لئے، دریائی جہاز، ہوائی جہاز، ریل، تار، اور علمی تقریروں کو ایک شہر سے دوسرے شہر تک منتقل کرنے کے ہوائی آلات موجود ہوں، جب اعلیٰ سے اعلیٰ کاغذ، تصاویر، اور مطابع موجود ہوں جو ذہنی اور فکری ترقیوں کو بلند سے بلند کرنے کو تیار ہوں تو پھر بتایئے کہ علمی وفنی ترقی کے لئے اس سے اونچا زمانہ کہاں سے آئیگا؟ مگر اس پر بھی زبانِ اُردو کے علماء واصحاب قلم اپنی درماندگیوں کو آج بھی جو بیٹھے رو رہے ہیں اوس کے چند تلخ اسباب ملاحظہ ہوں۔

ا- سبب اول یہ کہ ہندوستان میں موجودہ زمانے کی تعلیم وتربیت سے "تعلیمی ذہنیت" ضرور پیدا ہوتی ہے مگر "علمی ذہنیت" نہیں اسی لئے حصول علم کا شور اپنی حد سے گزرا ہوا ہے مگر علماء پیدا ہونے کے عیوض دفتری محرر اور افسر پیدا ہوتے ہیں، ورنہ بتایئے کہ پھر بی، اے، اور ایم، اے کے پاس طبقہ تھیٹر، سینما، گھوڑ دوڑ، ہاکی، فٹ بال، کرکٹ، اور یورپ

لٹریچر پر جتنا حریص ہے اوتنا علمی مضامین اور علمی مطالعہ پر حریص کیوں نہیں
پھر "غیر علمی ذہنیت" پیدا ہونے کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستانی
فضیلت کی سند حاصل کر کے بھی غیر قومی آداب واطوار اور غیر قومی
اشیاء کا قدر دان اور شائق ہوتا ہے اور اپنی آبائی تھذیب سے نفرت کرتا ہے
چنانچہ جن ہندوستانی امراء اور اصحاب دولت کو وطنی مصنوعات
اور وطنی افکار کا سب سے زیادہ قدردان اور سرپرست ہونا چاہیئے تھا
کیا سبب کہ وہی امراء اور اصحاب دولت "پانیر پسند" اور "یورپ طلب"
بنے چلے جا رہے ہیں؟ اور ان کی زندگی کے کسی آخری گوشہ میں بھی وطنی
زبانوں وطنی فنون اور وطنی عادات واوضاع کی جھلک اور سرپرستی کا
جذبہ موجود نہیں؟

۲ - سبب دوم یہ کہ زبان اُردو کے باوصف خالص ہندوستانی
پیداوار ہونے کے اسے ہندو، سکھ، پارسی، اور دیسی عیسائی، اپنی مادری
اور ملکی زبان تسلیم کرنے کو تیار نہیں رہے مسلمان تو اون کے دماغوں پر
صرف یہ عقیدہ غالب ہے کہ دماغ و دولت کی تمام مقدرتیں خرچ کر کے
انگریزی زبان کو مادری زبان سے زیادہ بہتر طریق پر سیکھ لینے ہی میں نجات ہے

نتیجہ یہ ہے کہ آج ۹۵ فیصدی انگریزی یافتہ مسلمانوں کی اُردو ایسی ہی ہے جیسے کسی زمانے میں لالہ لوگوں کی فارسی ہوا کرتی تھی۔

۳۔ سبب سوم یہ کہ اردو کی تباہی میں خود اُردو کے اخبارات اور رسالے خاصا حصہ لے رہے ہیں اور وہ اس طرح کہ آج کل اردو کے اخبارات اور رسالے اونہی لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جو تعلیم جدید کے اثرات سے متاثر ہی نہیں بلکہ مخبوط سے ہو چکے ہیں، لہذا اخبارات اردو اور رسائل اُردو کے تیار کرنے والوں نے اپنی قومی غیرت کے فقدان اور اُردو میں کافی مقدرت نہ ہونے کے باعث اس کے ذخیرۂ ادب میں غیر زبانوں کے بے ضرورت اور بے محل الفاظ اس کثرت سے ٹھونس دیے ہیں کہ اگر ان کی اردو کو میر انیسؔ اور مرزا داغؔ کی مکمل اور شیریں اردو سے ملایا جائے تو ان دونوں میں مسلم اور نومسلم کا فرق نظر آئیگا۔

۴۔ مطبوعات اُردو یا تصنیفات اردو کو بہتر سے بہتر الفاظ میں شہرت دینے کے لئے اخبارات اُردو اور رسائل اردو میں نہ صلاحیت نہ جذبہ، حد ہو گئی، کہ مُلّا رموزی ایسے مقبول مضمون نگار کی کتابوں کو نمایاں کرنے کے لئے ان اخباروں نے اوس سے اتنے مضامین معاوضہ میں طلب کئے

کہ بالآخر وہ تھک گیا اور اوس نے اپنی کتابیں ان اخباروں اور رسالوں
میں تنقید و تشہیر کے لئے بھیجنا ہی بند کر دیا، پھر نئے مصنفین کی کتابوں کا
حشر سامنے ہے۔

۵ - ہر زبان کی ترقی کا ذریعہ یا حکومت یا دولت مند طبقہ ہوتا ہے
چنانچہ آج ہندو روسا، اور ہندو دولت مند ہندی زبان کو ہندوستان کی
واحد اور سرکاری زبان بنانے کیلئے اپنی دولت کو جس فراخ حوصلگی سے
صرف کر رہے ہیں، جتنے زیادہ مطابع اور اہل قلم ہندی زبان میں کام کر رہے
ہیں اوس کا لازمہ یہ ہے کہ آج ہندی زبان میں سیاست و اخلاق اور
مذہب و معاشرت سے لیکر زندگی کے ہر حصہ پر کافی ذخیرہ معلومات کا
مل سکتا ہے، بخلاف اس کے مسلمان کی
تمام تر دولت یا یورپ کی سیاحت پر صرف ہو رہی ہے یا یوروپین
وضع کی تفریحات پر بلکہ مجھے تو اطمینان ہے کہ یورپ کی تفریحی تقلید میں مسلمانان
ہند نے جتنی دولت مس زبیدہ جان ناٹک والی پر خرچ کر دی ہے اوتنی
دولت سر سید علیہ الرحمۃ کو بھی نہ ملی ہوگی!!! - اور صرف مسلمان
کی اُردو سے اس یکسر بے خبری کا باعث ہے کہ آج زبان اُردو

علوم و فنون اور حیات بخش ذخیرۂ ادب سے خالی ہے، اور تاریخ وطن اور تاریخ اردو ... میں موجودہ زمانے کے مسلمانوں ....
اس بے حیا ذہنیت پر جو کچھ لکھا جائیگا اون کی آیندہ نسلیں بھی اون پر نفریں بھیجنے پر مجبور رہوں گی۔

میرا مقصد تحریر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ قوم میں زوال و غلامی، غیر قومی علوم اور غیر قومی تربیت سے جو افلاس انگیز اور موت آور ذہنیت پیدا ہوگئی ہے قومی افراد کے دماغوں میں متانت و سنجیدگی نام کی جو خشکی اور افسردگی پیدا کردی گئی ہے، ملازمت کی لعنت اثر زندگی اور اولاد کی کثرت سے جو مالی تباہی پھیل پڑی ہے اور اس سے جو مزاجی خشکی اور دماغی پریشانی چھائی ہوئی ہے اوس کا یہ "مولویانہ اثر" ملاحظہ ہو کہ ہندوستانی لوگ اپنی تفریحی مجالس اور تفریحی تقاریب میں بھی اتنے گاڑھے اور موٹے موٹے واللہ جیاپچے بنے رہتے ہیں گویا قہقہہ انہیں دس دس سال کی سزا دیدی جائیگی اگر وہ اپنی تفریحی محفل میں کہیں ہنس پڑے"۔
بس مسلمانوں کی رونے والی فطرت کی حد ملاحظہ ہو کہ حضرت میر انیس نے

اپنے مرثیہ میں شجاعت پناہ امام حسین رضی اللہ عنہ کی شجاعت و تیغ افگنی کے جتنے جوش انگیز واقعات لکھے انہیں تو طاق پر رکھدیا اور مرثیہ کا وہ حصہ لیکر بیٹھ گئے جس میں رونے اور رولانے کے حالات جمع ہیں، پس چاہتا ہوں کہ یہ رونے والی قوم میرے ذخیرۂ تحریر سے زندہ دلی، خوش دماغی، ہنسی اور خوش طبعی کی امنگ اور مسرت اندوز زندگی کی بہاریں حاصل کرے۔ اور نول کشوری مطبع کے مولویوں نے جتنی کتابیں قیامت اور دوزخ کے عذابوں سے ڈرانے اور رولانے کے لئے لکھی ہیں اون کے مقابل جنت کی بہاروں کا کوئی تحریری نمونہ بھی موجود رہے۔

ایک وقت وہ بھی تھا جب ظرافت میں سیاست یا سیاست میں ظرافت کا رنگ بھرنا اصحاب قلم کے بس کی بات نہ تھی اور آج بھی یہی عالم ہے کہ ظرافت نگار تو بدقسمتی سے آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر ان کا قلم جو کچھ لکھتا ہے اوس کے چھچھورپن سے اپنے مضامین کو بلند رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہو سکتا تھا کہ میں اپنے مضامین میں پھر کوئی امتیازی انداز پیدا کروں پس اس مقصد کے تحت میں نے چند ایسے مضامین لکھے جو خالص علمی موضوعات کی شان رکھتے تھے

اور ان پر کوئی مولوی ہی قلم اوٹھا سکتا تھا، مگر میں نے انہی خشک موضوعات
کے ظریف کردار کو پیش نظر رکھکر انپر جو کچھہ لکھا اس کا مقصد یہ تھا کہ متانت
پیشہ یا خشک فطرت قوم میں اسیطرح علمی مذاق اور ظریف تحریروں کو
مقبول بنایا جائے ورنہ آپ ہی بتائے کہ "زکام" اور "کھانسی" پر
گل بنفشہ، عناب، گاؤزبان، شربت بنفشہ، حب سرفہ، اور لعوق سپستان
تو لکھا جا سکتا تھا۔ مگر مضمون نہیں، اسیطرح میں نے "رائے قانونی
زندگی، شکایت وغیرہ خشک موضوعات پر علمی ظرافت کا رنگ چڑھا کر
پیش کیا۔ غرض یہ ادنیٰ غیر ظریف موضوعات کے ظریف کردار کا ایک
نمونہ ہے جو پسند آجانے پر اور زیادہ مقدار میں پیش کیا جائیگا۔

اس کتاب کا نام "شفاخانہ" علاوہ مضامین کی صحیح نسبت کے اسلئے
بھی رکھا گیا ہے کہ اسے پڑھ کر غم والم فکر و پریشانی کے امراض میں
مبتلا قوم کو صحت حاصل ہو۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ "شفاخانہ" اوسی
گھر کا نام نہیں جس میں آدمی اور اسکی بیوی بیمار ہوکر جاتی ہے بلکہ
شفاخانہ اس گھر کا نام ہے جہاں سے انسان موت اور خطرات سے
محفوظ اور خوش دل ہوکر نکلتا ہے۔ اس مقدمہ کے بعد "گلابی اردو"

کے عنوان سے جو "دیباچہ" لکھا گیا ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ یہہ طرز تحریر میرا سب سے پہلا طرز تحریر ہے جس کے ذریعہ میں ملک میں روشناس ہوا ہوں، اور میرے قدردان بھائیوں اور بھنوں میں ایسے بیشمار بہن بھائی موجود ہیں جو میرے اسی طرز تحریر کو پسند کرتے ہیں۔ پس کچھہ تو اس طرز تحریر کے بقا، اور یادگار کے طور پر اور کچھہ ان حضرات کے پاس خاطر کے طور پر "گلابی اُردو" کا ایک دیباچہ عرض ہے

ے گر قبول افتد زہے عز و شرف

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ رسولہ الکریم والسلام علیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

۲۲ شعبان المحترم ۱۳۵۱ھ ہجری اسلامی،

۲۱ دسمبر ۱۹۳۲ء عیسوی۔

ملا رموزی

گلابی اُردو

فیروزی دیباچہ

اماں بعد اے محترم مفت کی کتابیں پڑھنے والو!
کیا مگر اُچک لے گیا شیطان راندا ہوا عقلوں درجہ سوم تمہاری کی کو یا
نہ رہی غیرت بیچ دلوں سیاہ تمہارے کے کہ پڑھتے ہو کتابیں تم مانگ کر
دوستوں بھی محلے والوں سے مگر نہیں شرماتے تم پس قسم ہے اس بے شرمی
تمہاری کی کہ گالیاں دیتا ہے تم کو پیچھے تمہارے وہ شخص کہ مانگ کر لاتے
تم کتاب جس سے، پس اگر باقی ہے بیچ دل و دماغ تمہارے کے
حرارت اے گرمی غیرت کی تو خود خرید کر پڑھا کرو تم کتابیں موافق
پسند اپنی کے کیونکہ البتہ تحقیق ہے یہ کام بُرا پس دور ہو تم اوس سے
اور جو نہیں سکتے ہو یا نہیں سکتی ہو تم خریدنا مبلغ کتاب کا بہ سبب
افلاس اپنے کے تو صبر ہی بہتر ہے واسطے تمہارے کیونکہ نہیں ہے

اور البتہ تحقیق نہیں ہے ضروری یہ کہ فروخت کیجائے غیرت بدلے کسی
کتاب کے جیسی کہ فروخت ہورہی ہے غیرت اور حیا ہندوستانیوں
کی ذریعہ سے نئے تمدن اور نئی تھذیب کے۔ پس کیا نہ دیکھا تو نے اے
شاگرد نیک بخت کہ چلتی ہیں اور اوپر سڑکوں ٹھنڈی کے ہندوستان
زادیاں ادھاکر سینہ اپنا ساتھ طریقوں یورپ کے مگر یہ کہ بے خبر ہیں وہ
رسوائی اپنی سے مگرائے عجب ماں باپ ایسی مسماتوں کے۔
پس تحقیق کہ نہیں ہے یہ دیباچہ ہذا مگر ملا ہوا اوپر نکتوں چند اور
اوپر چٹکلوں چند کے، اگر سکو تم کرنا غور کا اندر نکتوں اس کتاب اور
اندر ناچ مس زبیدہ جان۔ پاؤڈر لگا کر ناچنے والی کے کہ تحقیق یہی ہے
اور لاجرم یہی ہے وہ کتاب بیچ زبان اردو کے کہ صحیح ہے عبارت اس کی
از روئے قواعد زبان کے بھی باوصف ہونے اسقدر موٹی کے خالی ہیں سطریں
اسکی بے ضرورت الفاظ اور جملوں انگریزی سے جس طرح خالی ہوا کرتی ہیں
وعدے اور اقرار دولت مندوں کے یا جیسے خالی ہوتے ہیں طلبہ اکثر
اس زمانے کے مردانہ شجاعت سے یا ڈاکٹر لوگ ہمدردی اور مروت سے یا
جس طرح خالی ہوتے ہیں اکثر پیر اور صوفی اس زمانے کے کرامت اور

نفع پہونچانے سے یا ایڈیٹر اخباروں اردو کے علوم سیاست اور اصول اخبار
نویسی سے یا بی، اے، ایل، بی، لوگ صحیح اردو لکھنے سے بھی، موافق
قول حکیم بزرجمہر کے یہی ہے وہ کتاب ہذا کہ پڑھنے اس کے سے پیدا ہوتی ہے
جوانی اُمنگ ترنگ بھی خوشی اور ہنسی اندر آدمی بھی مسماۃ کے پس اگر ہو تم
رکھنے والے عقل سلیم اور مذاق علمی کے تو خریدار پہونچاؤ ہم کو اس کتاب کے تھا
کثرت زیادہ کے تا دن حشر کے نجات پاؤ تم تعزیرات ہند اور پریس ایکٹ
سے بھی محل موتیوں کے ملیں تم کو بھی مسماۃ تمہاری کو بیچ دہلی کے، کیوں کہ
قسم ہے بڑھاپے پنڈت مالوی اور موٹاپے مولنا شوکت علی صاحب کے کی
اجب لطف اُوٹھاتے ہو تم کتاب سے مُلّا رموزی کی تو لطف پہونچاؤ تم
خریداروں زیادہ سے مُلّا رموزی اپنے کے کو۔
اب کیا کیا خوبیاں مُلّا رموزی بھی کتابوں اوس کے کی جھٹلاؤ گے؟

بخار

دیوبندی فرمائش کے مضمون نگار ہر مضمون کو جب اما بعد سے شروع کرتے ہیں تو پہلے از روئے لغت و بلاغت اس کے معانی و مطالب سمجھاتے ہیں پھر کہیں اصل مضمون شروع کرتے ہیں لیکن علی گڈھ والے اسے لغویت کہتے ہیں اور ابتدا ہی سے اصل قصہ شروع کردیتے ہیں بعض مضمون نگار اپنا مضمون شروع کرتے وقت منطق و فلسفہ کے موٹے استعارے، اور اور مصطلحات استعمال کرتے ہیں اور عوام اس کے فوائد سے ایسے ہی محروم رہ جاتے ہیں جیسے ہم اور آپ ہندوستان کی خام پیداوار سے، مگر ہم ان سب کے خلاف ہیں اور آج کل مسلمانوں کا شعار زندگی ہی اختلاف ہے لہذا جان جایئے کہ ہم قدرے دیوبندی مضمون نگاروں کے مقلد ہیں اس لئے آج ہم پہلے اپنے مضمون کے قدرے معنی سمجھاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ بخار کے معنی ہیں یکایک جامۂ انسانیت سے باہر ہو جانا۔ ایسی حرکتیں کرنا جو عوام و خواص کے نزدیک مضحکہ انگیز ہوں، مثلاً دن رات چارپائی پر پڑے رہنا۔ اُچھلنا کودنا، چلانا، ایک دم چپ سادہ لینا، پھر چلانا، ادھم کرنا، ہائے ہائے کرنا، اللہ میاں کو بہ کثرت پکارنا، توبہ کرنا، لحاف پر لحاف

اور بڑھے چلا جانا، کم کھانا، زیادہ پینا، اور بیوی بچوں کو دیکھنا اور رونا، پس اس قسم کی علامتیں جس میں پائی جائیں سمجھو کہ یہ بخار میں مبتلا ہو گیا ہے، اب از روئے طب یونانی جس قسم کے بخاری آج کل پائے جاتے ہیں ان کے نمونے ملاحظہ ہوں ....

.... یہ بخار والے

کو بائے صفت کے ساتھ جو بخاری کہا ہے تو اس سے شہر بخارا کے وہ بخاری مراد نہیں ہیں جو علوم عربیہ پڑھنے کے لئے ہندوستان سے مر کر ہی وطن واپس جاتے ہیں اور کبھی تکمیل نہیں ہونے پاتی، بہر حال بخاری سے مراد بخار میں مبتلا ہونے والا یا ہونے والی ہے اگر اس میں کوئی علمی غلطی ہو تو اسے کاتب کی غلطی سمجھئے۔

بادشاہوں کا بخار! بفضل ایزدی یورپ بہ استثنائے حکومت تندرست ترکی جس قدر بادشاہ لوگ ہیں انہیں ایک مرتبہ بخار ضرور آتا ہے مگر ان لوگوں کو بخار سے اس وقت تک صحت نہیں ہوتی جب تک کہ یہ لوگ تبدیل آب و ہوا نہ کریں اور تبدیل آب ہوا صرف یورپ ہی میں ہوتی ہے، یورپ کی اس آب و ہوا کی شفا بخشی پر دہلی کے "بڑے حکیم جی" بہت حیران ہیں کہ جو گیا

صحت یاب ہو گیا یہ کبھی نہیں سنا کہ ایک دیسی بادشاہ صاحب یورپ ہی میں دھرے رہ گئے، الّا مہاراجہ گوالیار سو وہ بھی اپنی غلطی سے فرانس چلے گئے تھے۔ سنا ہے کہ دیسی رئیسوں کے لئے یورپ کے دفتر خارجہ میں اچھے اچھے نبض شناس موجود ہیں! ان لوگوں کے مصارف علاج، رعایا ٹیکس دینے والے اور کاشتکار ادا کرتے ہیں جو کوئی مضائقہ کی بات نہیں،

امیروں کا بخار | امیروں کو بخار آتے ہی ان کی کوٹھیوں میں سناٹا طاری ہو جاتا ہے جہاں حضور نے کروٹ لی کہ یوروپین ڈاکٹر حاضر ہو گیا ان کے بخار کی ابتدا ایک ہزار روپیہ یومیہ فیس والے ڈاکٹر سے ہوتی ہے اور انتہا دس ہزار روپیہ فی گھنٹہ فیس والے ڈاکٹر پر یہ لوگ یونانی دواخانہ دہلی کی دواؤں کو اتنا ہی غیر شائستہ سمجھتے ہیں جتنا یورپ والے سوراج کے لئے آپ ہندوستانیوں کو غرض بخار کی ہر حرکت میں انگریزوں کی حرف بہ حرف نقل کرتے ہیں، لیکن جب ڈاکٹری تشخیص "آپریشن" پر مجبور کرتی ہے تو پھر آہستہ سے دہلی والے "بڑے حکیم جی" کا پلٹس استعمال کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں، امیروں کے بخار آنے سے ان کی "عورت ذات" روتی چلاتی نہیں، البتہ فقیروں کے نام سے ان کی ملازمین

خوب پلاؤ کھاتے ہیں "صدقے کے بکرے" ذبح ہوتے ہیں پیروں کے نذرانے دیئے جاتے ہیں اور مستحقین بھوکے مرتے رہتے ہیں، امیروں کا بخار اکثر تاش کھیلنے اور گھوڑ دوڑ، وغیرہ سے بھی جاتا رہتا ہے۔

لیڈروں کا بخار ہندوستانی لیڈروں کو کافی چندہ جمع کر لینے کے بعد بخار ضرور آتا ہے اِن لوگوں میں بخار آنے کو کہتے ہیں "کام کرتے کرتے صحت خراب ہوگئی ہے" اور جوں ہی کہ صحت خراب ہوئی اِن کو ڈاکٹروں نے تقریر بند کر دینے کا مشورہ دیدیا اور منصوری یا شملہ تو وائسرائے ہند کے ڈر سے جاتے نہیں البتہ اگر چندہ کافی ہے" تو یورپ ضرور جاتے ہیں ورنہ "کشمیر" اور اگر شدہی کا بھی زور رہا تو اکثر لیڈر کسولی بھی جایا کریں گے لیڈروں کو بخار آتے ہی اردو اخبارات کے صفحات سیاہ ہوتے رہتے ہیں روزانہ ان کی سابقہ خدمات کے تذکرے ہوتے ہیں "رفتار صحت" شائع ہوتی ہے۔ بیمار لیڈروں کو اخبارات "صاحب فراش" کہتے ہیں جیسے ہندو اخبار پڑھنے والے "فراش" پڑھتے ہیں ان لوگوں کا جسم بھی تولا جاتا ہے، اس موقع پر وہ بولیں کہ کیا لیڈروں کے وزن کے ساتھ اِن کی ایماندارانہ قومی خدمات بھی تولی جاتی ہیں؟ اس پر ہم نے جھنجھلا کر کہا

دیکھو جی تم ہو "صنف نازک" تمہیں اس قسم کے سوالات کا کیا حق ہے
ان کی حالت اخبارات میں ہمیشہ "ردی صحت" رہتی ہے یہ کبھی نہیں
کہ آج تو ختم البتہ کبھی کبھی "حالت نازک" ہو جاتی ہے اور جو کبھی بیمار
لیڈر صاحب ہوئے قوم کے مسلمان تو بس پھر حالت نازک ہوتے ہی
تمام مساجد میں دعائے صحت کے لئے ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور چلا چلا کر اللہ
دے اور بندے اس موقع پر وہ بھر لیں کہ مسلمان مرد جلسوں میں
ہماری طرح بات بات پر رویا کرتے ہیں ؟ ہم نے کہا کہ لیڈر خود رو رو کر
تقریر کرتے ہیں اور اسی کو کامیاب تقریر سمجھتے ہیں۔

افسروں کا بخار | یوں تو خدا ہر ہندوستانی کو غلام ہی رکھے کیونکہ اس کا افسر
ہونا اس کے ہم قوم ماتحتوں کے لئے قیامت سے کم نہیں بڑی مصیبت یہ ہے
کہ پچاس روپلی کا ہندوستانی ملازم بھی خود کو افسر سمجھتا ہے لیکن خصوصیت
سے خدا مسلمانوں کو مسلمانوں کا افسر تو کبھی نہ بنائے کیونکہ غریب ہندوستانی
مسلمان کا دماغ افلاطون کے دماغ سے کسی طرح کم نہیں ہوتا ہے اگر کوئی
ہندوستانی افسر صاحب بیمار ہو گئے یا حرارت ہی ہو گئی تو بس آپ کی
بیمارداری کے لئے تمام عملۂ ماتحت کو ہڑتال کرنا پڑتی ہے جس ماتحت کو

دیکھئے آپ کے دولت کدہ پر خیریت دریافت کرنے حاضر ہے اور اگر کوئی خدا کو
رازق سمجھنے والا حضور کے دولت کدہ پر حاضر نہ ہوا تو سمجھ لو کہ افسر صاحب کی
نظر میں اس کے برابر گستاخ، نمک حرام، کام چور اور نااہل کوئی دوسرا نہیں
ہمارے ایک دوست نے تجربہ کیا کہ افسر صاحب کی بیماری میں مستعدی سے
ان کے پاؤں داب ڈے دوسرے ہی مہینہ اُن کا اضافہ کر دیا گیا، غرض
ان کی بیماری کی تمام خانگی خدمات سرکاری اہل کار اور چپراسی انجام دیتے ہیں
یہ ایک ہی دن کے بخار میں اس قدر کمزور ہو جاتے ہیں کہ ماتحتوں سے سیدھی
طرح بات نہیں کرتے جبھی تو خدا ان ہندوستانی گنجوں کو سوراج کے ناخن
نہیں دیتا۔

<u>بچوں کا بخار</u> | اللہ عمر دراز کرے ہمارے ننھے میاں کی عمر کے بچے بخار سے
اتنے ہی بے پروا ہوتے ہیں جتنا یورپ والے مشرقی ممالک کو آزادی دینے
سے لہذا جب بچوں کو بخار آتا ہے تو صرف ان کا منہ لال ہو جاتا ہے مگر وہ
کھیلتے ہی پھرتے ہیں البتہ ان کی والدہ کا بُرا حال ہوتا ہے چنانچہ ادھر بچہ کو
بخار آیا اور اُدھر اس کی ماں نے اس کے باپ پر مصیبتوں کا پہاڑ توڑ دیا، حکم
ہوا کہ جاؤ حکیم کو لاؤ، ڈاکٹر کو لاؤ، بڑے مولوی صاحب کو لاؤ، پیر صاحب کو لاؤ

تعویذ لاؤ، بکرا ذبح کرو، نیاز دو، فاتحہ پڑھو، ادھر اللہ میاں سے کہنا شروع کیا
اگر میرا بچہ اچھا ہو گیا تو، نفل پڑھوں گی، روزے رکھوں گی مساکین کو کھانا
کھلاؤں گی، وغیرہ اب اگر ان تمام باتوں میں سے کسی ایک کے متعلق شوہر
صاحب نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا تو پھر قیامت ہے۔ رات بھر بچہ کو گود میں
لئے بیٹھی ہیں، کبھی روتی ہیں تو کبھی دعا کرتی ہیں۔ اب اگر کہیں دن بھر کی
ملازمت کی تھکن سے شوہر صاحب سو گئے تو اودھم مچا دی۔ گو صبح کی ٹھنڈی
ہواؤں سے خود چراغ پا ہو کر رہ جاتی ہیں، مگر رات بھر تمام گھر مصیبت میں
مبتلا رہتا ہے، گویا ایک بچہ کو بخار نہیں آتا تمام خاندان بخار میں مبتلا کر دیا جاتا ہے

طلبہ کا بخار طلبہ کا بخار نہایت پر لطف ہوتا ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں دس
برس سے بیس برس کی عمر تک روزانہ بخار آنے کی تمنا ہر طالب علم کے دل میں
خود بخود پیدا ہوتی ہے خصوصاً مدرسہ کے اوقات میں نہایت پابندی سے
بخار آتا ہے اور اگر بے رحم والدین نے اس حالت میں بھی مدرسہ بھیج دیا تو
پھر طالب علم درجہ میں بیٹھتے ہی نہایت اہتمام سے کراہتا ہے ہات کر رومال سے
سر کو باندھ لیتا ہے، بخار کے ساتھ ہی سر میں درد، پیٹ میں درد، اور ہات
پاؤں میں درد ضرور ہوتا ہے کیونکہ درد کسی ماسٹر کو نظر نہیں آتا ہے۔ لہذا

جہاں چاہا درد بتلا دیا، خاص کر ریاضی اور دینیات، کے گھنٹوں میں درد حد سے گزر جاتا ہے مگر ہاکی اور فٹ بال کے وقت طاعون کے طلبہ بھی تندرست ہو جاتے ہیں۔ البتہ تعلیم کا گھنٹہ شروع ہوتے ہی طالب علم منہ بسور لیتا ہے اُسے اُبکائی پر اُبکائی آتی ہے۔ آنکھیں پل پل کر سرخ کر لی جاتی ہیں، جمائی پر جمائی لی جاتی ہے، یہاں تک کہ ماسٹر تنگ آکر چھٹی دیدیتا ہے اور طالبعلم صاحب اسکول کی عمارت کے سامنے تک نہایت ضعیف رفتار سے چلتے ہیں گویا آپ کو چکر آ رہا ہے، لیکن جوں ہی کہ اسکول کی عمارت سے آگے بڑھے کہ قہقہہ لگایا اور بخار جاتا رہا گویا ماسٹر کو بے وقوف بنا لیا، ایسے بخار میں لاڈ پیار کرنے والے ماں باپ سے یہ بخاری طالب علم سائیکل، جوتا، موزے اور فیشن کی ہر چیز آسانی سے وصول کر لیتے ہیں۔

ہمارا بخار اسلامی عقیدہ ہے کہ خدا اپنے محبوب بندوں کو بیمار کر کے ان کے گناہ اور بلائیں کم کر دیتا ہے دوسرے یہ کہ بیماری اصل میں انسان کے جسم کی زکوٰۃ ہے، لہذا اس حساب سے ہر مسلمان کو جسکی ہمارے سوا کم از کم ہفتہ میں ایک مرتبہ ضرور بیمار ہونا چاہئے آپ کاہلی نہ سمجھیں تو ہم کہے دیتے ہیں کہ دنیا میں اگر ہم کسی کام کو بدترین کام سمجھتے ہیں تو وہ غسل کرنا ہے اور اسی لئے

ہم بجز عیدین کے کبھی نہیں نہاتے کیونکہ اس میں علاوہ پانی کے اصراف کے وقت بھی تو ضائع ہوتا ہے۔ مگر بُرا ہو اس موسم گرما کا کہ ۱۰ جون ۱۹۲۸ء کی دوپہر کو بے دم کر دیا، ادھر قوم کی ظالمانہ قدردانی اور منافق دوستوں کی درا ندازیوں سے خس خانہ بھی باقی نہیں ہے۔ لہذا چاروناچار غسل جو کیا تو لُو لگ گئی صبح جو بستر سے اُٹھنا چاہا تو اکڑے ہوئے بیٹھے، تنگ آکر لیٹے ہی لیٹے کلمہ شریف پڑھا مگر تھوڑی ہی دیر بعد حرارت شروع ہو گئی، حرارت میں یہ ہوتا ہے کہ اچھا خاصا انسان خواہ مخواہ اکڑنے لگتا ہے جمائیاں بہ کثرت آتی ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہات پاؤں بھی جب اونچے نیچے ہونے لگے تو ہم نے اُن سے کہا کہ

"دالان میں چارپائی بچھا دو اور لحاف اوڑھا دو کیونکہ ہمیں بخار آنے والا ہے"

وہ بولیں نہیں تو وہم ہو گیا ہے جاؤ باہر چبوترے پر جا بیٹھو ذرا دل بہلاؤ تو مگر دل زرا نہ بہلا اور ہات پاؤں مٹکاتے ہوئے پھر گھر میں آگئے اور کہا کہ چادر اڑھا دو، پھر کہا لحاف اُڑھا دو، پھر کہا دوسرا لحاف، پھر تیسرا لحاف، پھر چوتھا پھر پانچواں، پھر چھٹا، پھر ساتواں پھر آٹھواں، پھر نواں، یہ گویا تمام عزیزوں کے

لحاف تھے جو ہمارے اوپر ڈال دیئے گئے مگر سردی کم نہ ہوئی تو وہ بھی ہماری
اوپر لد پڑیں مگر کپکپی کا یہ حال کہ جاتی ہی نہ تھی یہاں تک کہ اب ہمیں خبر نہیں
کہ ہم کہاں گئے آنکھ کھلی تو کہا سیلا بچی لاؤ اور اب غوغو کرنا شروع کر دیا جسے
عرف عام میں استفراغ کہتے ہیں، اس کے بعد کہا "ارے رے" اُف رے
اللہ رے یا اللہ، یا خدا، توبہ، توبہ ہے توبہ، ہائے رے، کہ پھر اب جو آنکھ
کھلی تو دیکھا کہ وہ رو رہی تھیں۔ مگر ہم نے اُنہیں روتا دیکھ کر پھر آنکھیں اب
جو کھلی تو ایسا معلوم ہوا کہ لاہور کے ہندو مسلم فساد میں کسی سکھ نے ہمارے
سر میں کرپان مار دی ہے اور سر ہے کہ مارے درد کے اُٹھایا نہیں جاتا، کبھی
ایسا معلوم ہوتا کہ بغیر اجرت بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے جسم چور ہو گیا ہے کہ پھر اب جو
آنکھ کھلی تو ایسا معلوم ہوا کہ دہلی میں قیام امن کے لئے پولیس خواہ مخواہ گولی
چلا رہی تھی اور ہماری دونوں ٹانگوں میں گولی لگ گئی ہے لہذا ماری درد کے
لگے چارپائی پہ پاؤں مارنے کہ پھر، اب جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ بیٹھی پاؤں
داب رہی ہیں اس وقت معلوم ہوا کہ غریب گھرانے کی لڑکی سے شادی کرنے
سے یہ فائدہ بھی ہوتا ہے ورنہ اس وقت اگر ہوتی گوئی گرلس اسکول کی تو
جھولے پہ آکر سی بیٹھی رہتی اور خادمہ کو حکم دیتی کہ پاؤں دابو کہ یکایک ننھے میاں

چیخ ماری اور اُنہوں نے ہمارے پاؤں چھوڑ کر ننھے میاں کو گود میں لے لیا کیوں کہ ننھے میاں کو آشوبِ چشم کا عارضہ تھا، اور گو ہم نے پھر بھی ٹانگیں مار ہیں خوب شور مچایا مگر اُنہوں نے ننھے میاں کے مقابل ہماری طرف دیکھا بھی نہیں کہ پھر، اب جو آنکھ کھلی تو دین و دنیا کی راحت حضرت والدہ محترمہ سرہانے بیٹھی ہیں مگر بے حد ملول و آبدیدہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے اور عرض کیا کہ آپ آرام فرمایئے صرف دعا کا محتاج ہوں کہ پھر، اب جو آنکھ کھلی تو محترمہ ممدوحہ نے فرمایا کہ بیٹا گھبراؤ نہیں تمہیں بخار ہے کہ ہم پھر، اب جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ عزیز ہمشیرہ اور قبلۂ دوجہاں والد صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں کہ ہم پھر اب جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ یہ تمام سرپرست اور شفیق و مہربان دعائیں کر رہی ہیں کہ ہم پھر، مگر فوراً ہی سنبھل کر کہا کہ ہمیں تکیہ کے سہارے سے بٹھا دو اس وقت بخار کی شدت لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی اور ہمارے حواس اُس بیٹھتے ہی ہم نے دھواں دھار تقریر شروع کر دی جو شدید بخار کی حالت میں ہر لیڈر، مدبر، فلاسفر، اور اڈیٹر کرتا ہے عنوانِ تقریر تو صرف اتنا تھا کہ۔

"ہم اچھے ہو جائیں گے آپ حضرات گھبرائیں نہیں مگر الفاظ کی شوکت، ترتیب، ترصیع اور بندش کی تعریف کچھ سننے والوں

ہی کو معلوم ہے اور گو تقریر ہم نے کی تھی مگر خود ایک لفظ یاد نہیں رہا
البتہ ہماری وہ تقریر جسکو اُنھوں نے کسی قدر قلمبند کیا تھا
یہ ہے، مثلاً ہم نے یکایک کہا:۔

پانی لاؤ، لاؤ، لاؤ، لاؤ، لاؤ، جب پانی دیا تو کہا کہ آہیں
پیاز کا بگھار کیوں نہیں دیا؟

ان جملوں کو عنوان کی تقریر سے ملاتے جایئے دیکھئے کسقدر ربط و مناسبت ہے
پھر کہا، جی ہاں، جی ہاں بہت اچھا حاضر ہوا حالانکہ اس وقت ہمیں کسی نے
آواز نہیں دی تھی، پھر کہا ٹوپی لاؤ ٹوپی جج کا وقت جا رہا ہے، عمر گزر گئی،
لنڈن اور پیرس جانے کے سوا مکہ معظمہ کا کبھی خیال بھی نہیں آیا اور نہ آج
کل کے مسلمان امیروں کو آتا ہے مگر پھر کہا ارے بھائی تانگہ لاؤ ورنہ حج
ہو جائیگا، پھر کہا نہیں نہیں مضمون غلط چھپا ہے غلط پھر کہا سو روپیہ فی صفحہ
لیں گے سو روپیہ حالانکہ اردو کا ایک رسالہ بھی نہیں جو ایک روپیہ فی صفحہ
معاوضہ دیتا ہو سب کے سب، براہ کرم، ہی طلب فرماتے ہیں، پھر اس
انگریز کو سامنے سے علیحدہ کرو خدا معاف فرمائے یہ ہمارے بڑے سالے
صاحب تھے اور اسی لئے وہ بعد صحت بہت خفا تھیں اور کہتی تھیں کہ تم

بخار میں بہت بکتے ہو اور اب دیکھنا اس مضمون کو پڑھ کر وہ اور بھی آگ بگولہ ہو جائیں گی کہ ہم نے ظاہر بھی کر دیا پھر کہا وہ منی آرڈر والا آگیا خدا سمجھے افلاس میں ایسی ہی سوجھتی ہے غرض اس تقریر کا وہ زور رہا کہ الامان، مگر آخر میں کہا لا الٰہ اشہد ان اللہ استغفر اللہ مگر یہ الفاظ قبلہ والد مدظلہ کی ڈانٹ کا نتیجہ تھے ہمارے اسلام دوستی کا اثر نہیں کہ ہم پھر، اب بخار نے اپنی آخری شدت اختیار کرلی کہ یکایک قارورہ کی حاجت ہوئی اور ہم لحاف پھینک کر اُٹھے اب جو قارورہ کے لئے چوکی پر جاکر بیٹھے تو اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ شدید بخار کی حالت میں قارورہ کرنے میں جو لطف آتا ہے اسے بخار والے ہی کچھ خوب جانتے ہیں خیر وہ اُٹھا کر لائیں اور ہم چارپائی پر آتے ہی بھر، اب جو آنکھ کھلی تو کیا دیکھتے ہیں کہ قبلہ محترم حکیم حاذق مولوی ضیاء الحسن صاحب ہمارا ہاتھ پکڑے بیٹھے ہیں، ہم نے ادب سے سلام کیا۔ قبلہ موصوف نے ہمارے علمی دماغ اور علمی مزاج کی نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت مختصر نسخہ تحریر فرمایا لیکن جب عطار کے ہاں سے یہ نسخہ لایا گیا تو بے مبالغہ ایک سپاہی کا فوجی راشن تھا، تیار ہوا تو کوئی نصف سیر پانی تھا جسے اللہ شافی اللہ کافی کہہ کر انہوں نے پلایا تو کیا پیٹ میں بھر دیا حکیم صاحب قبلہ نے ازراہ مرحمت

حکیمانہ چلتے وقت ہمارے لئے دنیا کی تمام غذائیں حرام کر دیں صرف دلیا اور کھچڑی حلال فرما گئے یہ بھی فرمایا کہ ذرا لحاف میں دب کر پسینہ لے لو جس کی تعمیل فوراً کرائی گئی اور چار لحاف شروع ماہ جون کے جہنمی موسم میں ہمارے اوپر ڈال دیئے گئے اب جو دم گھٹنے لگا تو ہم نے کوشش کی کہ قدرے چہرہ باہر نکال لیں کہ چیک کر بول ہی اٹھیں کہ ”دیکھو دیکھو پسینہ میں لحاف الگ نہ کر خدانخواستہ اگر ہوا لگ گئی تو پھر کیا ہوگا“ خیر صاحب بقول کسی شاعر کے غصہ فقیر کا اوپر جان فقیر کی کے چپ سادھے پڑے رہے اور جب پسینہ میں نہا گئے تو انہوں نے پسینہ خشک کیا اور اب طبیعت بحال ہوئی۔

اب بھوک کا یہ زور کہ تمام دنیا کے کھانے اڑانے کو طبیار مگر وہاں حکیم صاحب کے دلئے کے سوا کوئی چیز جائز نہیں دلیا کھایا ہی تھا کہ جاڑا شروع ہوا اور ہم پھر، کہ انہوں نے ہمیں ہوشیار کر کے کہا دیکھو کوئی آواز دے رہا ہے اب یہ محلہ والے عیادت کو آنا شروع ہوئے پردہ کرایا اور کہا آ جائیے یہ محلے کے ایک بزرگ تھے آتے ہی ہم ایسے بخار زدہ مریض سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کیوں کیسی طبیعت ہے؟ کل تو تم اچھے تھے کیا لو لگ گئی ہے خیر جاتی رہے گی، کہ دوسری آواز آئی انہیں بھی اندر

بلا لیا گیا تو آتے ہی بعد سلام مسنون آنکہ اُنہوں نے ہماری نبض ملاحظہ فرمائی کہ تیسری آواز آئی یہ بھی گھر میں آئے ادہر تو عیادت والوں کی آمد اُدہر گھر کی تمام عورتیں کمرہ میں بند اور مارے گرمی کے آفت ہیں مگر عیادت والوں کا سلسلہ ترقی پذیر تھا ہمارا ضعف کے مارے بُرا حال مگر ارباب عیادت ہم سے جو سوالات ہو رہے تھے وہ اس طرح کہ۔

کوئی نبض دیکھتا ہے، کوئی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بخار کا اندازہ کرتا ہے ایک صاحب نے فرمایا کیوں مولانا کیا حال ہے پھر فرمایا اماں تم بھی اتنی سی بُخار یہ میں لیٹ گئے۔ ہم تو تمہاری عمر میں ایسے بخار کو خاطر میں بھی نہیں لاتے، اچھا تو یہ بتلاؤ بخار کب سے آیا ہے، جاڑے سے آتا ہے؟ متلی تو نہیں ہوتی سر میں درد ہے؟ کھانسی تو نہیں ہے؟ پسینہ آتا ہے یا نہیں کس وقت اُتر جاتا ہے؟ منہ کا ذائقہ کیسا ہے، بھوک بھی معلوم ہوتی ہے یا نہیں؟ مگر یہاں ضعف سے یہ حال کہ، مگر اُنہوں نے ہمارا ہاتھ پکڑ کر زور سے ہلا یا اور فرمایا مولانا، مولانا، او مولانا، بولو تو، ہوشیار تو ہو، دیکھو یہ کون کون بیٹھا ہے۔ اچھا تو بتاؤ یہ کرسی پر کون بیٹھا ہے؟ کیا دل گھبراتا ہے۔ غرض سوالات کی کثرت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم بنگال کی کسی بغاوت

کے مقدمہ میں بحیثیت سلطانی گواہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہیں اور دس بارہ وکیل ہم سے جرح کر رہے ہیں، خیر یہاں تک بھی معاملہ غنیمت تھا مگر اب عیادت والوں نے ایک اور ستم ڈھایا، ایک صاحب بولے ۔

"ہاں بھائی علاج کس کا شروع کیا ہے؟ ہم نے حکیم صاحب کا نام بتلایا تو اونھہ کہکر حکیم صاحب پر اعتراضات شروع کر دیے اور ایک دوسرے حکیم صاحب کے علاج کی تعریف شروع کر دی ایک صاحب بولے کہ میاں تم تو علاج والاج چھوڑو بس آم کا شربت پی لو تمام شکایتیں جاتی رہیں گی ایک صاحب نے تو ہماری حجامت ہی بنا ڈالی ۔ فرمانے لگے مولانا گرمی بہت ہے آپ یہ سر کے بال اسی وقت منڈوا دیجئے"

غرض عیادت کیا تھی خاصا جلیان والہ باغ کا انگریزی مارشل لا تھا جس میں سب کچھ گزر گئی اسی طرح کوئی ایک ہفتہ بخار میں مبتلا رہے نصف تنخواہ رخصت میں وضع ہوگئی، دس روپیہ کے قرض ہوگئے عیادت والوں کی خاطر میں کوئی پانچ روپیہ کی پان چھالیہ خرچ ہوئی تین روپیہ حکیم صاحب کے تانگہ کے دیئے بیس روپیہ فیس میں گئے والدین اور انھوں نے زور زور

آنسوؤں کے دریا بہا دیئے معاوضہ کے مضامین نہ لکھ سکے، بارے بفضلِ خدا اب صحت یاب ہوگئے مگر ہماری قوم کو اتنا ہی غم ہوا کہ

"عرصہ سے ملا صاحب کا کوئی مضمون نہیں دیکھا اور بس؟

اگر یورپ کا کوئی مضمون نگار ہوتا تو قوم اس کے تمام مصارف خود ادا کرتی، یوں بیمار ہوا کرتے ہیں ہندوستان کے غربا، دعا ہے کہ خدا ہمیں ہمیشہ تندرست رکھے اور یہ جس قدر انگریز یورپ والے ہمیں تہذیب سکھانے کے لئے ہندوستان میں پڑے ہیں خدا کرے انھیں ایک ایک سال ایسا ہی بخار آئے +

کھانسی

بیماری، مرض، علالت، ناسازیِ مزاج، وغیرہ الفاظ انساں کی اس حالت کے اظہار کے لئے خاص ہیں جب اس کی عام صحت میں کوئی تغیر واقع ہو جائے اور وہ بجائے دفتر جانے کے شفاخانے جانے لگے، یا وہ ملا رموزی کی کتابوں کا پارسل منگانے کے عوض "دواخانہ یونانی دہلی" کے پارسل منگانے لگے، یا وہ اچھا خاصا، تعلیم یافتہ، اور عقلمند ہونے پر

بھی یکایک جامۂ انسانیت سے باہر ہو کر جانوروں کی سی حرکات کا مرتکب ہونے لگے"
یا وہ دوستوں کے گھر جانے کی جگہہ حکیم صاحب کے مطب میں بیٹھ کر کہے کہ "اُفو
حکیم صاحب اب تو مجھسے مارے درد کے بیٹھا نہیں جاتا تو سمجھو کہ وہ بیمار
ہو گیا ہے۔

لیکن بیماری کے ساتھ ہی زبان اردو میں کسی ایسی عادت کو بھی بیماری
کہتے ہیں جو اعتدال اور معقولیت سے ذرا ہٹ کر ایک مستقل اور مسلسل
فعل کی صورت اختیار کرے، مثلاً کسی افیونی آدمی کا ہمیشہ گردن نیچے
کر کے بات کرنا، دوا کے قابل بیماری تو نہیں مگر اصطلاحی بیماری ضرور ہے
یا کسی تانگے کے گھوڑے کا ہر وقت اپنے مکان کے سامنے چلتے چلتے
رک جانا، بگڑنا، بدکنا، اور سواریوں کا سہم کر کہنا کہ بسم اللہ، بسم اللہ،
ارے بھئی کیا خراب گھوڑا ہے تیرا، تو یہ عادت گھوڑے کی بیماری کہلائے گی
کہتے ہیں کہ بیماریوں میں بیماریاں طاعون، ہیضہ، انفلوائنزا، اور
نمونیا، یا پھر، مرگی، مراق، مالیخولیا، اور جنون سب سے نمایاں بیماریاں ہیں
مگر ہمارے خیال میں ان سب کو بیماریاں کہنا صحیح نہیں جب ان میں بیماری
یا مرض کی وہ دلفریب ادائیں نہیں جو انسان کو یکایک کچھ سے کچھ بنا دیتی ہیں

بلکہ یہ تمام حالتیں تو انسان کو "خدانخواستہ" بنانے والی ہوتی ہیں اور جس چیز سے انسان ختم ہو جائے اُسے موت کہنا زیادہ موزوں ہے۔ نہ کہ مرض یا بیماری، مثلاً آپ کسی کھانسی کے مریض کو لے لیجئے اور اس کے چہرے کو اس وقت دیکھئے جب وہ چند شریف اور ذی اثر لوگوں کے مجمع میں بیٹھا کھانس رہا ہو۔

کھانسی کے وقت انسان پر جو حالت طاری ہوتی ہے۔ اس کی چند صورتیں یہ ہیں۔

بعض حجاب اور غصے کی وجہ سے دل ہی میں کھانس لیتے ہیں، اور کبھی کبھی بہت خفیف سی "اوہنہ اوہنہ" یا اخ اخ یا "اُخو اُخو" کی آواز سننے میں آجاتی ہے۔

۲۔ بعض کے دونوں شانے اٹھ کر کانوں تک آجاتے ہیں جب کھانسی پوری ہوتی ہے۔

۳۔ بعض کی کھانسی اس وقت تک پوری نہیں ہوتی جب تک انہیں مراد آباد کا اگالدان پیش نہ کیا جائے۔

۴۔ بعض کے نزدیک وہ کھانسی ہی نہیں۔ جسکے ترنم کا سلسلہ

مغرب سے صبح کی اذان تک اس طرح جاری نہ رہے کہ ماں باپ تنگ دعا کریں
کہ اسے خدا یا اسے ایمان سے اٹھالے یا اس کی کھانسی کو بند کردے۔

۵۔ بعض لوگ کھانسی میں تال سُر اور نغمۂ موسیقی پیدا کرنے کے عادی
ہوتے ہیں اور مجال نہیں کہ کھانسی کی کوئی آواز وزن ردیف، قافیے
اور بحر سے علیحدہ تو ہو جائے مثلاً اگر کھانسی کا پہلا رکن فعلن فعلن ہو تو کھانسی
کی پوری غزل اور اس کا ایک ایک "مصرع" اسی وزن پر ڈھلتا چلا جائیگا
بجز اس کے کہ اس غزل کا "کف آور مقطع" ذرا ہٹ جائیگا، اس قسم کی
کھانسی اکثر باپ کی عمر والے لوگوں کو ہوتی ہے بیٹے کی عمر والوں کو نہیں۔
اور اسی لئے اس کا سلسلہ انا للہ والے وقت تک قائم رہتا ہے۔

۶۔ بعض کھانسی کو مارے تاؤ کے منہ سے باہر نہیں نکلنے دیتے اور
اور گلا گھونٹ کر یوں کھانسنے بیٹھ جاتے ہیں گویا وہ کھانسی سے کہہ رہے ہیں
لے اب تو چل۔

اس زور شور کی کھانسی پر خدا ان حکیموں سے سمجھے کہ یہ وہی ۳۰۰ سنہ
قبل مسیح کے زمانے کا "لعوق سپستاں" عطا فرماتے ہیں۔ جس کا نتیجہ
بجز اسکے کچھ نہیں کہ جاڑے جایئے اور کھانسے جایئے، اس کی کھانسی کے

شباب کا وقت اکثر نصف شب سے تہجد کی نماز کے وقت تک رہتا ہے
اور یہی وقت گھر والوں اور محلے والوں کے آرام کا مقرر ہے۔"

لطیفہ: کھانسیوں میں کم عمر بچوں کی کھانسی بھی ایک خاص چیز ہوتی ہے
مثلاً شب کے سکون بخش لمحات میں جب ان کی کھانسی کا نغمہ شروع ہوتا ہے
تو آپ آرام سے سو بھی نہیں سکتے اور انہیں سزا یا بد دعا بھی نہیں دے سکتے
پھر اس خواب شکن کھانسی پر ان بچوں کا ۵۷ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے رونا
چلانا ایک ایسی لطیف اذیت ہوتی ہے جس میں سارے خاندان کو خواہ مخواہ
شریک ہونا پڑتا ہے، ان کی کھانسی میں زیادہ لطف اس وقت پیدا
ہوتا ہے، جب ان کا علاج حکیموں اور ڈاکٹروں کو چھوڑ کر محلے
کی بوڑھی عورتوں سے شروع کرایا جاتا ہے۔ بوڑھی عورتوں کے اس علاج کا
کیا جواب ہو سکتا ہے۔ کہ جب وہ ایک جان سے بیزار بچے کی کھانسی کے لئے
بتاتی ہیں کہ فلاں درخت کے سبز پتوں کو جلا کر ان کا دھواں اس کی ناک سے
گزار دو انشاء اللہ ابھی کھانسی بند ہو جائیگی اور تجربے کا جو طبی ثبوت پیش
کرتی ہیں وہ یہ کہ میرے بچے کی کھانسی بھی اسی سے بند ہوئی تھی بعض کسی
پیر کی قبر پر جلنے والے لوبان کی راکھ کھلانا بتاتی ہیں اور بعض کے خیال میں

کھانسی کا کوئی علاج مفید نہیں بجز اسکے کہ بچے کو چالیس دن تک اپنی حالت پہ
چھوڑ دیا جائے کہ کھانسی کا زور چالیس دن کے بعد خود بخود گھٹ جاتا ہے۔
ایک کھانسی خاندان کے سب سے آخری بزرگ کی ہوتی ہے اس کھانسی
میں متعدد لطائف اور حکمتیں مضمر ہوتی ہیں، مثلاً اس کے ہر وقت موجود
رہنے کے فوائد یہ ہیں۔

۱۔ رات کو اس گھر میں چور داخل نہیں ہو سکتے جس گھر میں کوئی بوڑھا
رات کو کھانستا رہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ اگر چور گھر میں داخل بھی ہو گئے اور یہ کھانس دے تو
انہیں عین چوری کی حالت میں فرار اختیار کرنا پڑتا ہے، بوڑھوں کی کھانسی
گھر کی بے احتیاط بہو بیٹیوں کے لئے بھی بے حد مفید ہوتی ہے۔ چنانچہ
جہاں بوڑھے نے کھانسا اور گھر کی الھڑ اور بے احتیاط بہو بیٹیاں فوراً ہوشیار
ہو گئیں، یہی کھانسی اس بوڑھے کے گھر میں قدم رنجہ فرمانے کا اعلان بھی ہوتی ہے
جہاں انہوں نے دروازے پر "اونہہ" یا "اُخو" یا "اخ" کیا اور تمام
عورتیں دوپٹے سنبھال کر بیٹھ گئیں یہ کہکر کہ "لو وہ دادا میاں آ گئے"
ان دادا میاں کی کھانسی شریر بچوں کے لئے بھی استاد کا کام کرتی ہے۔

جہاں دادامیاں نے ”اُخّو“ فرمایا اور بچے سہم کر بیٹھ گئے یہ کہکر کہ ارے وہ دادامیاں ابھی جاگ رہے ہیں۔

گھریلو کھانسیوں میں سب سے زیادہ شاعرانہ کھانسی نوجوان لڑکیونکی ہوا کرتی ہے انہیں اگر کھانسی شروع ہو جائے اور گھر میں ایک آدہ مرد بھی بیٹھا ہو تو ان کا مارے حجاب کے بُرا حال ہو جاتا ہے، یہ کھانسی کو روکنے کیلئے بار بار اپنے منہ پر ہاتھ رکھتی ہیں یا مکان کے کسی بند کمرے میں جا کر چھپ جاتی ہیں مگر جب اس پوشیدہ حصے میں بھی کھانسی بند نہیں ہوتی تو یہ کھانسی پر غصہ کرتے کرتے یکایک اس حرکت پر کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہیں یہ کہکر کہ ”آگ لگ جائے بند ہی نہیں ہوتی“

ایک معنی آفریں کھانسی مقرر، واعظ، اور لیکچرار“ کی ہوتی ہے اس کھانسی کے فوائد بھی بے شمار ہیں۔ مثلاً تقریر کرنے والا اپنی تمام کمزوریوں کو کھانسی کے پردے میں چھپا لیتا ہے۔

کھانسی کے وقفے میں وہ آنے والے مضامین کو سوچ لیتا ہے۔ کھانسی کے وقفے میں اسے پانی منگانے کا قانونی حق حاصل ہو جاتا ہے اور اس عرصے میں وہ سامعین کے خوف کو دل سے کم کرتا جاتا ہے۔ جوں جوں اسکی

کھانسی بڑھتی جاتی ہے اس کے ہاتھ پاؤں کا رعشہ کم ہوتا جاتا ہے، کبھی کبھی وہ اپنی کھانسی میں مسلسل نغمے پیدا کر کے اپنے آپ کو تقریر کے اہم حصوں سے بچا بھی لیتا ہے یا یہ کہکر کہ افسوس کھانسی سے مجبور ہوں کل سے بخار بھی ہے وہ تو آپ حضرات کے اصرار پر میں کھڑا ہو گیا تھا۔

گھریلو کھانسیوں میں سب سے زیادہ ذلیل اور شرمندہ کرنے والی کھانسی وہ ہوتی ہے جو کھانا تناول فرمانے کے بالکل بیچ میں بغیر کسی تمہید و تقریب کے عین اس وقت چل جائے جب ایک موٹا سا لقمہ آپکے حلق میں جا رہا ہو اور ابھی جانہ چکا ہو کبھی کبھی اس موقع پر یہ لقمہ حلق سے یوں باہر پھینک دیتی ہے کہ پاس بیٹھا ہوا آدمی اس بدتمیزی پر آپ سے لڑنے کو تیار ہو جاتا ہے مگر خون کا گھونٹ پی کر چپ رہتا ہے، اور جو کھانسی سے یہ لقمہ باہر آنے کے عوض حلق ہی میں پھنس کر رہ جائے تو پھر کھانسنے والے کا حال دیکھنے کے قابل ہوتا ہے اس قسم کی کھانسی کا لطف اس وقت پورا ہوتا ہے جب آپ کھانسی سے حلق میں پھنسے ہوئے لقمے کو نیچے اتارنے کے لئے پانی کا گلاس بڑے زور اور اطمینان سے اٹھائیں اور اس میں ایک بوند بھی نہ ہو۔

اسی قسم کی کھانسی سے ملی جلی کھانسی وہ ہوتی ہے جب آپ کسی فی اثر

بزرگ یا حاکم سے ہمہ تن مصروف ہوکر نہایت ادب سے باتیں کر رہی ہوں
کہ یکایک چھالیا کا ایک دانہ آپ کے حلق میں اُتر کر کھانسی پیدا کر دے
اس طرح کہ پھر پوری قوت صرف کرنے سے یہ بند نہ ہو۔ پھر دیکھئے اس بزرگ
یا افسر کے سامنے آپ کی ندامت کا حال بس جی چاہتا ہے کہ اگر اس وقت
یہ کھانسی آدمی بنکر سامنے آجائے تو اسے قتل ہی کر کے رکھ دوں، یا اس
بزرگ ہی کو قتل کر کے اپنے سامنے سے ہٹا دوں۔

ایک کھانسی افیونیوں کی ہوتی ہے، اس کھانسی میں اگرچہ کوئی
خاص شاعری اور لطافت نہیں ہوتی پھر بھی اگر کسی ہوٹل میں آپ کے برابر
بیٹھا ہوا کوئی افیونی چائے پی رہا ہو اور اسے کھانسی چل جائے تو پھر آپ
ہی اپنی پیالی کو فی سبیل اللہ چھوڑ کر اٹھ آئیں گے مگر آپ سے اس کی کف
آور آواز نہ سنی جائے گی اس لئے کہ اس کی کھانسی کی "اُہوں اُہوں"
کا خاتمہ نہایت درجہ تکلیف دہ نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے۔

ایک کھانسی وہ ہوتی ہے جو شکاریوں کے ذوق کی دشمن ہوتی ہے،
اس کھانسی کا زور اسی وقت ہوتا ہے جب شکار کے سامنے آنے کا وقت
ہو جائے، آپ چاہیں کہ شکار کے آنے سے قبل دل کھول کر کھانس لیں

مگر وہ تو اسی وقت شروع ہوگی جب آپ چاہیں گے کہ شروع نہ ہو۔ اُس وقت اس کھانسی کی روک تھام میں خود شکاری صاحب ایک لطیف سا تماشا بن کر رہ جاتے ہیں اور آیا ہوا شکار بھاگ جاتا ہے۔ اس کھانسی کی بدولت کبھی کبھی شکاری کا حلیہ یوں ہوتا ہے کہ بندوق ہاتھ میں آنکھیں شکار پر اور منہ کے اندر رومال کی گیند۔"

ایک کھانسی وہ ہوتی ہے جو ریل کے سیکنڈ کلاس میں رات کے وقت چلتی ہے۔ اس طرح کہ برابر سونے والے مسافر گردن اُٹھا اُٹھا کر آپ کو دیکھنے جاتے ہیں اور آپ مارے شرم کے ان کی طرف منہ نہیں پھیر سکتے۔

ایک کھانسی وہ ہوتی ہے جو مشاعرے میں غزل پڑھنے سے پہلے شروع ہوتی ہے یہ کھانسی شروع نہیں ہوتی بلکہ شروع کی جاتی ہے۔ اسلئے کہ شاعر کی خوشامد کی جائے اور سارا مجمع آپ کی غزل کیلئے سراپا اصرار بنجائے اس قسم کی کھانسی لکھنؤ کی طرف زیادہ کھانسی جاتی ہے یا "کھانسا جاتا ہے۔

ایک کھانسی قوال کی ہوتی ہے جو قوالی شروع کرنے سے پہلے کھانسی جاتی ہے اس کا مقصد گانے کے لئے گلا صاف کرنا ہوتا ہے۔

ایک کھانسی غنڈوں کی ہوتی ہے جو کسی راہ گیر کو مخاطب کرنے یا دشمن پر آوازہ کس نے یا اُسے دھمکانے کے لئے کھانسی جاتی ہے یہ کھانسی دکانوں اور بازاروں کے چوراہوں پر کھڑے ہوکر اور ذرا سینہ تان کر کھانسی جاتی ہے اس قسم کی کھانسی پر یہ آجکل کے اسکولوں کے عورت نما فیشن ایبل لڑکوں کو بہت زیادہ تاؤ آتا ہے کیونکہ غنڈوں کی ایک کھانسی اسکول کے لونڈوں کے لئے بھی خاص ہوتی ہے۔

ایک کھانسی جنگل یا رات کے خطرات سے ڈر کر یا خطرات کو دور کرنے کے لئے کھانسی جاتی ہے۔

ایک کھانسی پولیس کے ڈرپوک قسم کے سپاہی رات کو گشت کے وقت کھانستے ہیں۔

اس قسم کی تمام کھانسیاں اگر سمٹ کر ایک ہو جائیں تو ان کا نام "دمہ" رکھ دیا جاتا ہے، پھر "دمہ" کے لطائف بجز اسکے کچھ نہیں کہ آدمی نہ دین کا رہتا ہے نہ دنیا کا۔

اِن تمام کھانسیوں میں ایک لطافت خیز نکتہ ان کی مختلف اور رنگا رنگ آوازیں ہیں۔ مثلاً کھانسی کی کوئی آواز اس درجہ شاندار اور زوردار

ہوتی ہے گویا کھانسنے والا تمام محلے کے رہنے والوں کو ڈانٹ رہا ہے۔
بعض کی کھانسی میں اس نوع کا تسلسل ہوتا ہے جس سے زیر و بم اور تال سر کے تمام ضابطے مرتب کئے جا سکتے ہیں۔
بعض کی کھانسی کے درمیان اس قسم کے جھٹکے آتے ہیں جن سے اسکے "مرحوم" ہو جانے کا خطرہ اٹل ہو جاتا ہے۔
بعض کی کھانسی کا آغاز نہایت پُرشور ہوتا ہے مگر خاتمہ اس درجہ خفیہ ہوتا ہے کہ سامع خیال کرتا ہے کہ وہ اب کھانس چکا مگر ہوتا یہ ہے کہ کھانسی کی آواز بعد میں اسکے گلے سے اتر کر پیٹ میں جا کر کھانستی رہتی ہے یہ خصوصیت بوڑھوں اور افیونیوں کی کھانسی میں پائی جاتی ہے۔
بعض کی کھانسی اس رنگ کی ہوتی ہے کہ اسے سنکر کہنا پڑتا ہے کہ یہ شخص کھانسی کو نہیں کھانس رہا بلکہ کھانسی اسے کھانس رہی ہے۔
اب اگر ان کھانسیوں کے سوا کسی صاحب کو کوئی اور کھانسی ہو تو وہ براہ کرم "ملا رموزی" کو مطلع فرمائیں، یا براہ راست اس کی پاس آ کر سنا جائیں۔

منقول از رسالہ "ادیب پشاور"

زکام

وہ رسالہ "عالمگیر" کے "تصویر بخش" و تصویر کش حکیم قبلہ فقیر محمد صاحب
ہی سے دریافت کیجیے تو پچاس برائیاں، خرابیاں، تباہیاں۔ اور ہلاکیاں
بیان فرما دیں گے مرض زکام کی، اور جو طبی کتابوں میں اس مرض کی ہلاکت
آفرینیاں پڑھیئے تو جی چاہے گا کہ گریبان چاک کر کے اب جنگل کی طرف ہی نکل
جائے لیکن اگر حقیقی ماں باپ اور بیوی بچوں سے لیکر عوام و خواص تک سے
اس مرض کا تذکرہ کیجیے اس کی تکالیف بیان کیجیے تو آپ کو اُلٹا اُلّو خبطی
بزدل اور انگریزی میں "نان مرد" کہہ کر آپ کا خوب مذاق اُڑائیں گے
اور اب عوام و خواص کے اس جہل سے یہ حکیم اور ڈاکٹر تک یوں متاثر ہو چکے ہیں
کہ اگر ان کے پاس زکام کی حالت میں روتے ہوئے بھی جائیے تو ہنس کر
آپ کی طرف سے منہ پھیر کر کسی دوسرے مریض کی نبض پر ہاتھ رکھدیں گے
جس کا یہ مطلب ہوگا کہ آپ کو چونکہ زکام کی شکایت ہے۔ لہذا یہ ایسی تکلیف
وہ شکایت نہیں جس پر جلد متوجہ ہونا ضروری ہو، مگر ہم کہتے ہیں کہ وہ طاعون
اچھا کہ آج مرے اور کل دوسرا دن، مگر اس زکام کی نیم مردہ اور نیم زندہ

کیفیات کو ہم کس منہ سے بیان کریں، اور کس قلم سے لکھیں ؟

ہمارے رسالہ "عالمگیر" کے ایڈیٹر صاحب نے سالنامہ کے لئے ہم سے مضمون طلب فرمانیکا خط عین اسوقت لکھا جب ہم زکام میں مبتلا ہونے جا رہے تھے اور جب یہ خط ہمیں ملا اُس وقت ہم پورے مبتلا ہوئے سر پکڑے بیٹھے تھے کہ خط آنکھوں کے سامنے لگا کر بولیں کہ کیا اسے بھی نہ پڑھیئے گا ؟ مطلب یہ تھا کہ معاملہ تو ہے "زرِ نقد کا" اب معلوم نہیں زکام زدہ شوہر کو اس وقت زر طلبی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے یا بیوی کو ؟

بہر کیف یہ مضمون چونکہ زکام کی حالت میں لکھا جا رہا ہے اسلئے اگر آپ کو اس کی حالتیں اور صورتیں سمجھا دی جائیں تو آپ کو ہزاروں فائدے پہونچیں گے اور ہمارے لئے چند نیک طینت مرد اور چند اسکول کی پڑھی ہوئی لڑکیاں یہ یہ کہہ کر چپ ہو جائیں گی اور ہو جائیں گی کہ بے چارے اپنے مُلّا رموزی صاحب کتنے نیک ہیں کہ زکام کی حالت میں بھی قوم کو فائدے کی باتیں بتاتے رہتے ہیں اس لئے واضح ہو کہ ہم نہ تو قبلہ حکیم فقیر محمد صاحب چشتی کا مطب ہیں نہ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کا ہندوستانی اور یونانی شفاخانہ اور نہ ہی ڈاکٹر ایس "کے" برمن، کلکتہ ہیں جو زکام پر طبیاً، حکیماً اور "ڈاکٹراً" روشنی ڈالیں یا تاریکی ڈالیں البتہ ہم تو جتنے

اور جس قسم کے زکام اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں انہیں آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں مثلاً یہ کہ وہ علی گڈھ کالج کے سب سے زیادہ مشہور مشاعرہ باز پروفیسر "حضرت قبلہ مولنا احسن مارہروی مصنف "کتب کثیرہ" نے اپنی ایک کتاب بنام "تحفۂ احسن" کے صفحہ ۵۰ قیمتی ۸ پر زکام کی تعریف یوں فرمائی ہے کہ ؎

بن گیا ہے طبیب اک عطار × بیچ کر کچھ دوائیں ناقص و خام
دیکھئے اب کدھر گرے نزلہ × مینڈکی کو بھی ہو گیا ہے زکام

اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ "ملّا رموزی" کا دوسرا نام مینڈکی ہے ؟ غرض ان اشعار کا ترجمہ یہ لکھا ہے کہ معمولی آدمی کو گھمنڈ ہو جائے تو کہیں گے کہ مینڈکی کو زکام ہو گیا ہے ورنہ عقل میں نہ آنا کہ مینڈکی کو اگر زکام ہوا ہے تو اُسے طبیہ کالج کا بتایا ہوا "جوشاندہ" کس طرح پلایا جائیگا ؟ لہذا معلوم کیجئے کہ انسانوں کو زکام کس طرح ہوا کرتا ہے۔ پس سب سے پُر لطف قسم کا زکام "سفری زکام" کہا جاتا ہے مثلاً آپ کسی تھرڈ کلاس خاص کر کسی فرسٹ اور سکنڈ کلاس ڈبے کے اُس تھرڈ کلاس حصہ میں بیٹھے سفر کر رہے ہوں جس پر انگریزی میں "سروینٹ" لکھا ہوتا ہے تو کسی اسٹیشن پر آپ دیکھیں گے کہ پلیٹ فارم پر سے

یکایک ایک انگریزی قسم کا درویشانہ بستر آپ کے اوپر پھینک دیا جائے گا۔
اب اس "ضربِ بستری" سے آپ بھنّا کر اُٹھیں گے کہ اس "بستر انداز مسافر"
کا مارے جوتوں کے سر توڑ ڈالوں مگر کھڑکی کے باہر آپ بجائے کسی معمولی
مسافر کے ایک نہایت شاندار اور بیرسٹر قسم کے ہندوستانی کو کسی اپنے
ایسی عظیم الشان حیثیت والے ساتھی سے انگریزی گفتگو میں مصروف پا کر
آپ مارے خوف کے پھر اپنی جگہ پر خموش بیٹھ جائیں گے کہ گاڑی چلتے ہی
یہی بستر انداز اور بیرسٹر صورت کے فیشن ایبل مسافر صاحب ہاتھ میں "پائپ"
لیے کچھ بڑی ہی شان سے آپ کے اس تھرڈ کلاس ڈبے میں گھس آئیں گے
جس میں فرسٹ کلاس انگریزوں کے جوتے صاف کرنے والے نوکر سفر کرتے ہیں
اب آپ اور پریشان ہوں گے کہ آپ کے ڈبے میں یہ کہاں کا رئیس آگیا۔
شاید ریل روانہ ہوتے وقت یہ فرسٹ کلاس میں سوار نہ ہوسکے ہیں اس لئے بے چارے
گھبراہٹ میں اس تھرڈ کلاس ہی میں بیٹھ گئے خیر بیٹھ جانے دو آگے آنے والے
اسٹیشن پر اتر جائیں گے لیکن دوسرے اسٹیشن پر یہ صاحب بہادر پھر اتر کر
کسی فرسٹ کلاس ڈبے والے سے گفتگو فرمائیں گے اور جہاں ریل چلی کہ یہ
پھر آپ کے سرونٹ والے تھرڈ کلاس میں آجائیں گے اب آپ تو اپنے کندھا میں

ہونے کے سبب سے انہیں نہ پہچانیں گے اور ان کی انگریزوں ایسی صورت اور لباس سے ڈر کر اپنا بستر سمیٹے ایک طرف بیٹھے رہیں گے اور یہ ہوں گے کہ ایک کہنی کھڑکی سے نکالے سیٹی بجاتے ہوئے ریل کا بیرونی منظر ملاحظہ فرمانے جائیں گے مگر آپ سے بات نہ کریں گے، بیرونی منظر سے اُکتائیں گے تو اندر سر ڈال کر کبھی پتلون کی اس جیب میں ہاتھ ڈالیں گے کبھی کوٹ کی اُس جیب میں اور پھر کچھ بڑی ہی افلاطونی نظروں سے آپ کی طرف دیکھ کر ایک جیب سے "ہاتھی چھاپ سیگریٹ" نکال کر اُلٹی طرف سے چلائیں گے تاکہ آپ مجھ سے یہ نہ پہچان لیں کہ " ابے دیکھ لیا ہاتھی چھاپ پی رہا ہے " اسکے بعد اب پھر یہ کھڑکی سے باہر سر نکال کر سیٹی بجائیں گے مگر آپ سے بات نہ کریں گے جب اس سے بھی تھک جائیں گے تو "پانیر اخبار" کو خواہ مخواہ "پڑھیں گے مگر انگریزوں کی ایک بھی سیاسی حرکت کو نہ سمجھیں گے کیونکہ اگر اتنی ہی لیاقت ہوتی تو آزاد نہ ہو جاتے انگریزی غلامی سے گدھے کہیں گے" اب سمجھے آپ یعنی اسے کہتے ہیں "سفری زکام" کہ سفر تو کر رہے ہیں بیٹھا تھرڈ کلاس ہیں مگر دماغ میں بھرا ہوا ہے خاصا "سیکنڈ اَنلڈپن" اب اس زکام کی تفصیل یہ ہے کہ اس قسم کے مسافر کو

آپ جب دیکھیں تو سمجھ لیں کہ یہ آدمی یا کسی بڑے آدمی کا دوست ہے
اور یہ اُسکے ساتھ نوکر کے ٹکٹ سے سفر کر رہا ہے چنانچہ درمیانی اسٹیشنوں
تک فرسٹ کلاس ہی میں اپنے دوست کے پاس بیٹھا رہے گا اور
جہاں ٹکٹ کلکٹر کے دیکھ لینے کا اسے خطرہ ہوگا وہاں یہ فوراً فرسٹ کلاس سے
بھاگ کر آپ کے سروینٹ کلاس میں آ جائیگا مگر زکام کا یہ حال ہوگا کہ
کہ اس ذلت پر بھی آپ سے سیدھی طرح بات نہ کریگا۔ کم ظرف کہیں کا،
اور جو یہ نہیں تو خود ہوگا امیر زادہ اور دولتمند باپ کا بیٹا مگر بنی اسرائیل
پاس ہونے کی تجارتی ذہنیت کے اثر سے لباس تو پہنے گا انگریزی والد کا
مگر خرچ کم ہونے کی خاطر ٹکٹ لیگا تھرڈ کلاس ہی کا۔ کمینہ کہیں کا۔

اس زکام کا پہلا جو شاندہ تو وہ ہے جو مُلا رموزی اور اُسکے بھائی
صادق صبحی نے لاہور سے واپس آتے ہوئے انٹر کلاس میں ایسے ہی
زکامی فیشن ایبل مسافر کو سوار ہوتے وقت پلایا تھا یعنی جوں ہی کہ مسافر
صاحب نے برادرم صادق صبحی کے پاؤں برابر سیٹ پر کوئی چالیس من کا
بستر رکھا کہ صبحی صاحب نے دل میں یا علی کہہ کر جو ایک لات ماری تو بستر
موصوف کی گود میں اس پر جو بھنائے تو ہم دونوں نے کھڑے ہو کر ادب سے

عرض کر دیا کہ اگر اُف بھی کہا تو حضور ریل ہی کے باہر نظر آئیں گے کھینچیے زنجیر اور کیجیے رپورٹ ہماری، بس دہلی تک ہم جانتے ہیں کہ یہ "دام اقبالہ" کس طرح خوش بیٹھے رہے ہیں اور جو گئے ہیں تو دہلی کا ایک ایک یتیم خانہ تلاش فرمایئے اگر مل جائیں تو آمد و رفت کا کرایہ ہمارے ذمہ۔

اور دوسرا جو شاندہ یہ ہے کہ جب آپ کے ڈبے میں ایسے تھرڈ کلاس افلاطون صاحب تشریف لے آئیں تو پہلے حسب ضابطہ ان سے تہذیب کا برتاؤ کیجیے لیکن وہ کبھی بھی آپ کی تہذیب کو خاطر میں نہ لائیں گے اسلئے کہ ان پر تو زکام سوار ہو گا "فیشن ایبلیت" کا اس لئے پھر ان کی ہر ادا اور ہر حرکت کا خوب مذاق اُڑائیے، اور ہو سکے تو انہیں ہر قسم کی تکلیف پہنچایئے۔ کیونکہ ان کی تکلیف رسانی سے کسی قسم کا خطرہ اس لئے نہیں ہوتا کہ اس قسم کے مسافر اکثر بے ٹکٹ بھی ہوا کرتے ہیں اور وہ جو اپنے چہرے پر ذرا ڈپٹی کلکٹروں ایسا رعب پیدا کئے بیٹھے رہتے ہیں اس کا مطلب کبھی یہ ہوتا ہے کہ غریب مزاج کا ٹکٹ کلکٹر اور مسافران سے ٹکٹ کا سوال نہ کر سکیں۔ اس لئے ان سے بحیثیت مسافر بھی آپ اس طرح ٹکٹ طلب کیجئے کہ جناب عالی کہاں تشریف لے جا رہے ہیں جب وہ بڑے غرور سے کہیں کہ لکھنو تو کہئے کہ اُفوہ تو ذرا اپنا ٹکٹ مجھے دکھایئے کیونکہ میرا

ٹکٹ بھی لکھنو کا ہے۔ مگر اس پر ۱۲ آنے کم کیوں لکھے ہیں اس پر ٹکٹ دکھا دینا کوئی معیوب بات نہ ہو گی مگر دیکھ لینا کہ وہ آئیں بائیں شائیں فرما کر ٹالیں گے۔ بس آپ کو چاہئے کہ فوراً کسی ٹکٹ کلکٹر سے جا کر کہدیں کہ

ہاں ہاں وہ جو بڑے نخرہ سے بیٹھے سیگریٹ پی رہے ہیں"

ہاں ہاں یہی سامنے والے تھرڈ کلاس میں"

وہ دیکھو وہ آپ کے خوف سے اب اپنے منہ کو اخبار سے چھپا رہا ہے -

بے ہودہ کہیں کا"

بس اب جو آپ کے کہنے پر ٹکٹ کلکٹر ان کے پاس پہنچا کہ ان کا تمام سفری زکام کافور"

بدقسمتی سے ہندوستانی "علم کو علم کی خاطر" نہ خود حاصل کرتے اور نہ حکومت انہیں فاضل اجل تصور کرتی اس لئے ۹۹ فیصدی ہندوستانیوں کی معراج زندگی کہئے تو ملازمت ہے اور مقصود حیات کہئے تو ملازمت ہے اس لئے شدید سے شدید قسم کا زکام ہندوستانی افسروں کا زکام ہوتا ہے جس کی ابتدا مبلغ سو روپیہ کی غلامی عرف ملازمت سے ہوتی ہے، اُدھر عوام و خواص کی ذہنیت میں چونکہ بلندی اور وسعت نہیں۔ اس لئے جہاں کوئی کالے خال ورزیدار آنر یبل

صاحب سو روپیہ سے زیادہ ملازم ہوئے کہ اب نہ دل ٹھکانے نہ دماغ درست "
اس لئے اب باور فرمالیجے کہ انہیں زکام ہو کر رہے گا اور اب یہ ٹینس کھیلے بغیر
زندہ ہی نہیں رہ سکتے، پس ان کا زکام سب سے پہلے رخساروں کی سُرخی
اور گولائی سے شروع ہوگا اور جب ان کا پیٹ تو ندکہے جانے کے قابل ہو جائے
تو سمجھ لیجے کہ اب موصوف کو زکام ہو چکا، چنانچہ ہندوستانی افسروں کے زکام کی
علامتیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مزاج میں خواہ مخواہ کی خشکی، رعونت، اکڑفوں، پیدا ہو جائے گی،
یہاں تک کہ جس موقع پر انہیں کسی ضرورت سے تیز تیز چلنا ہوگا وہاں کبھی عہدے
اور افسری کے غرور سے آہستہ ہی چلیں گے۔

۲۔ ہنسی، مذاق، دل لگی، اور قہقہہ لگانے سے دانستہ طور پر پرہیز
کریں گے تاکہ چہرہ پر ہر وقت اس قسم کی خشکی طاری رہے کہ جو دیکھے وہ سمجھ لے
کہ آپ ضرور کہیں کے افسر ہیں یا آپ کے والد ہی مرثیہ خواں تھے اس لئے اب
چہرہ پر ہنسی اور خوشی کا کیا ذکر۔

۳۔ اب اگر افسری پر موٹر بھی ہاتھ آجائے تو سمجھ لیجے کہ اب حضور
ممدوح کا زکام بہہ رہا ہے۔ لہذا موٹر میں اُن کے زکام کی پہچان نمبر چار یہ ہوگی

کہ گذرنے والے لوگوں کا سلام اس انداز میں قبول فرمائیں گے کہ اگر سلام کرنے والا سمجھ لے تو جوتا ہی پھینک کر مار دے!

پہچان نمبر پانچ یہ ہوگی کہ افسری کے بعد ہی پہلے تو محلے کی مسجد میں اور مندر میں جانا ترک کر دیں گے پھر محلے والوں سے مراسم اور میل جول میں کمی فرمائیں گی یہاں تک کہ اب آپ انہیں نہ کسی غریب اور نہ محلے والے کے عقیقے میں پائیں گے نہ ختنے میں"

پہچان نمبر چھ یہ ہوگی کہ اپنے ماں باپ کا لباس چھوڑ کر انگریزوں کا لباس اختیار فرما کر اسے روشن خیالی اور ترقی بھی سمجھیں گے۔

پہچان نمبر سات یہ ہوگی کہ اپنی قومی تاریخ قومی روایات اور قومی آداب سے یکسر جاہل ہوں گے اور نپولین گلیڈ سٹون اور پاپائے اعظم روما کے حالات و روایات سے واقفیت کو شرف و فضیلت سمجھیں گے اور انہیں خیالات کا تو اثر ہے جو بے چارہ گاندھی آج تک مارا مارا پھر رہا ہے اور کوئی پوچھتا نہیں مگر ان گدھوں نے یہ نہ دیکھا کہ گاندھی اپنی ملکی اور قومی لنگوٹی کی عزت کیسے کیسے صاحبان مراتب سے منوا رہا ہے۔ مگر یہاں تو یہ زکام سوار ہے کہ شہر بھر میں افسر صاحب مشہور ہیں پس ان کے زکام کا بہترین اور مجرب جوشاندہ یہ ہے کہ آپ انہیں کسی حال میں بھی خاطر میں نہ لائیے، کچھ شک نہیں کہ ان لوگوں کا زکام قوم کی

عام صحت کے لئے نہایت درجہ وبائی نقصانات کا باعث بنا ہوا ہے اور ایسے ہی ہیں جنہوں نے قوم کی وحدت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے یعنی۔ امیر اور غریب ورنہ اگر انہیں زکام نہ ہوتا اور یہ غربا سے بھی مراسم اور تعلقات رکھتے تو قوم کے یہ دو ٹکڑے کبھی نظر نہ آتے خصوصاً مسلمانوں میں تو یا سب کو غریب کہا جاتا یا سب کو امیر لہذا ان کے زکام سے محفوظ رہئے۔

بیوی کا زکام بیوی کی حیثیت سے متعلق ہوا کرتا ہے مثلاً اگر آپ کی بیوی پرانے یا غریب گھرانے کی ہے تو اُس کا زکام اول تو تکلیف دہ نہ ہوگا اگر ہوگا تو خود اُس کے لئے ہوگا، اور جب آپ کی بیوی امیر گھرانے کی ہے اور اس پر کسی اسکول کی تعلیم یافتہ بھی پھر تو اس کے زکام کا علاج نہ ملا، موزی کے بس کا نہ کسی حکیم اور ڈاکٹر کے اختیار کا، اس کا زکام اس کے گھر میں دوسری عورتوں کی آنے سے شروع ہوتا ہے اور جب یہ کسی شادی بیاہ کی محفل میں پہونچ جائے تو سمجھو کہ اب اس کا زکام اسکے قابو ہی کا نہیں!

جہاں کوئی عورت اس کے گھر میں داخل ہوئی کہ اُسنے مارے زکام کے اُسکے سامنے پھولنا شروع کیا اور اس سب معاملہ میں وہ شوہر کو اس طرح ضرور شریک رکھتی ہے کہ

کیا بتاؤں بہن کیا کر رہی ہوں ؟

اُنہی کا مفلر تیار کر رہی ہوں خدا جانے مشین کب سے بند پڑی تھی کیونکہ اُسے میرے سوا کوئی دیکھنا بھی تو نہیں جانتا اور مفلر ہے یہ دیکھئے ریشم کا اُن کا کیا وہ تو حکم دے کر چلے گئے ہیں ، جی میں تو آتا ہے مشین توڑ کر پھینک دوں اِس سے پہلے بھی دو تین مشینیں ذرا میں توڑ کر پھینک چکی ہوں "

مگر وہ پھر ولایت گئے تو اسے لے آئے۔

خدا کا شکر ہے وہ میری ان عادتوں کو پہچانتے ہیں اور میں کتنا ہی بڑا نقصان کر دوں بس دیکھ کر ہنس دیتے ہیں "

ارے لا اندھی بیٹھی ہے اور دیکھ رہی ہے۔

ہاں وہ میز پر ہی تو رکھا ہے ،

باجہ باجہ کرتی ہے بے غیرت)

دیکھ اللہ رکھی اب تیرے مار کھانے کے دن آ رہے ہیں بہت سر اُٹھایا ہے تو نے ، لا اور وہ سوئیوں کی ڈبیہ دے۔

اری اُگالدان تو رکھ بہن کے سامنے "

واہ واہ ، آپا یہ الہ آباد کی ایک بڑی طوائف کا رکارڈ ہے۔

سبحان اللہ"
سمجھ میں آرہا ہے آپ کے؟
اری وہ پروں کا پنکھا لاکر جھل آپا کے اوپر"
کیا کہوں آپا آج خدا جانے یہ بجلی کو کیا ہو گیا ہے۔
صبح ہی سے پنکھا بند پڑا ہے۔
کچھ نہیں وہ دفتر سے آجائیں بس ایک حکم بھیجدیں گے تو پنکھا اُسی وقت درست کر دیا جائے گا اسی لئے تو میں نے فوراً یہ پروں کا پنکھا تیار کر لیا'
کس قیامت کی گرمی پڑ رہی ہے اب کی"
دیکھئے ہم پرسوں تک منصوری یا شملہ چلے جائیں گے۔ کون رہے بہن اس جہنم میں۔
محفل میں جو نیم انگریز لیڈی بنکر پہونچیں تو
دروازہ ہی سے ملازمہ کے ساتھ یوں مخاطب کہ
کیوں ری بے ہودہ تو میرا وہ سیاہ ہینڈ بکس نہ لائی حالانکہ میں نے تاکید کر دی تھی تجھکو
آداب عرض ہے۔
معاف فرمایئے گا وہ مجھے دیر اس لئے ہوئی حاضر ہوتے ہیں کہ پرسوں ہم لوگ

شملہ جا رہے ہیں بس اُس کی تیاری ہیں ایسی مصروف ہوں کہ عرض نہیں کر سکتی

مگر وہ تو آپ کے بچہ کی تقریب تھی،

جی ہاں پرسوں روانگی ہے پنجاب میل سے۔

جی نہیں۔"

ارادہ یہ ہے کہ شملہ سے منصوری چلی جاؤں گی کیونکہ وہاں بڑی بہاوج بھی ہیں ادھر چھوٹا بھائی وہاں کالج سے چھٹیوں میں آکر مل لیگا۔

وہ تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ تم اس مرتبہ پشاور بھی ہو آؤ کیونکہ تمہاری صحت بھی خراب رہتی ہے مگر دیکھئے اب خدا کو جو منظور ہو، وغیرہ،

اپنی مرضی کے بغیر پوری متانت سے بیٹھے بیٹھے اچانک آپ اچھل پڑیں یا کانپ جائیں تو سمجھ لیجئے کہ زکام شروع ہوگیا،

باتوں کے بالکل بیچ میں آپ ایک دم منہ کھول کر رہ جائیں۔"

اچھا صو۔صو۔صو۔ بابا آچھیں، آچھیں، صبح ملوں گا۔"

انشا آ۔آ۔چھی۔چھیں، چھیں اللہ تعالیٰ ضرور حاضر ہوؤں گا۔"

اور دیکھئے تو بس ذرا اٹھے آ۔آ، چھیں۔چھیں ٹھہر جائیے۔"

جب اس قسم کی حرکات کے آپ مرتکب ہوتے لگیں تو سمجھ لیجئے کہ زکام

شروع ہو چکا،

پس ہمارا جب یہ حال ہونے لگا تو بولیں،

تو وہ جوشاندہ کیوں نہیں پی لیا جاتا دن بھر ہو گیا ہے آچھیں آچھیں کرتے

بتایئے ان الفاظ میں زکام زدہ شوہر سے ہمدردی اور محبت ظاہر ہوتی ہے یا الٹا تاؤ اور طنز؟

کون صاحب؟

حا۔حا۔آچھیں۔حاضر ہوا"

وا۔وا۔آ۔آ۔آ۔آ۔آچھیں؛ آچھیں۔آچھیں؛ وعلیکم السلام

جی ہاں کیا بتاؤں رات ذرا بے موقع نہا لیا تھا،

جی ہاں نز۔نز۔آچھیں آچھیں نزلہ بھی ہے۔

میں خود آپ کے ہاں دو مرتبہ گیا تھا سبحان اللہ اماں تم خود غا، غا، غا آچھیں آچھیں غائب تھے،

ارے بھئی کوئی سر تو دبا دو میرا۔

آہ۔آہ۔اللہ۔اللہ،

ارے اب اب، آچھیں۔آچھیں، عبداللہ،

اُفوہ، اوہف اچھیں۔آ۔آ۔آچھیں،

یا اللہ تو گناہ معاف فرما"

جی کچھ بھی تو نہیں کھایا تھا مے۔مے، آ۔لاحول ولا چھینک ہی رُک گئی
ہاں میں نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا بس وہ ایڈیٹر صاحب آ۔آچھیں آچھیں
"عالمگیر" کے ہاں ایک پا۔پا۔پا۔آچھیں کمبخت پر اٹھا کھا لیا تھا صوصو
آ۔آچھیں صبح کے وقت"۔

غرض اس طرح دو تین دن ناک سے خاصا شور رہا بہہ جانے کے بعد اب
آپ کا زکام آپ کے چہرہ کو یوں حسین بنا دیگا گویا آپ کے منہ میں پمپ
لگا کر ہوا بھر دی ہے، اس کے ساتھ ہی شدید بخار کھانسی اور کبھی کبھی
آ۔آ۔آچھیں کے استخوان شکن جھٹکے آپ کو جانکنی کی تکلیف تک پہنچا دینگے
مگر اس عذاب الیم میں مبتلا دیکھ کر آپ کے ماں باپ اور بیوی بچوں سے
لے کر ایک ایک شخص آپ سے یوں ہمدردی کریگا کہ اماں لاحول ولا بس
اتنے سے زکام میں یہ حال،

ماشاء اللہ کیا مرد ہیں آپ؟

واہ کیا کہنا سبحان اللہ اماں بچے بھی اتنے نہیں گھبراتے ہیں۔

ار بھئی یہ زکام کھانسی بھی کوئی علاج والے مرض ہیں ؟

استغفراللہ اتنی سی زکیبہ ہیں جب یہ حال ہے تمہارا تو بھرا اور بیماریوں میں تو خدا جانے کیا حال ہوتا ہوگا تمہارا "

ممکن ہے آئندہ سال کے "سالنامہ" میں اپنے زکام کی کچھ تفصیلات بتلائیں فی الحال اگر ہو سکے تو مذکورہ بالا زکاموں کا علاج کیجئے "

پس مذکورہ بالا علامتیں جس شخص کے اوپر طاری پائی جائیں سمجھ لیجے کہ اسے زکام ہوگیا ہے ۔ فقط (منقول از رسالہ عالمگیر لاہور)

جبلپور تک

روایت ہے اور نہایت معتبر روایت ہے کہ سابق مولانا عبدالحق انجمن ترقی اُردو حال پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن جب سفر فرماتے ہیں تو ریل گاڑی نمبر تین عرف پسنجر ٹرین سے اس لئے کہ اس غریب تو از ریل گاڑی میں ممدوح کو تحریری کام کے لئے خاصا سکون حاصل ہوتا ہے یعنی اس میں مسافر زیادہ نہیں ہوتے ادھر یہ سنتے رہتے تھے کہ بزرگوں کے " پاؤں پر پاؤں رکھکر" چلنا عین سعادت ہے ۔ لہذا صوبجات متوسط میں انجمن ہائے

امداد باہمی کی طرح انجمن ہائے اردو کی طرح ڈالنے کے لئے اردو کے مذکورہ بالا باوا آدم علیہ السلام کے قدم بقدم چلنے کی خاطر تمام ریلوں کو چھوڑ کر پسنجر ٹرین ہی کو اختیار کیا تاکہ خیر و برکت کا باعث ہو۔"

پہلا ہی پہل یہ ہالے کہ ہم مذاق مسافروں کے عوض کم از زیادہ پورے چار نقشبند عرف گداگر لوگ "مولا مشکل کشا علی" کہہ کر برابر برابر آ بیٹھے۔ اب ان چار یار بر قرار کے بالکل بیچ میں ہم "پنجتن پاک" کی طرح جو نظر آئے تو ان لوگوں نے خالص ایم۔اے پاس جاہل دہریہ اور علوم اسلامی سے یکسر کورا سمجھ کر جو گداگرانہ معجزات و کرامات کے اظہار کا سلسلہ شروع کیا تو اطمینان ہو گیا کہ مسلمان قوم زوال ذلت کے دور میں جو داخل ہوئی ہے تو اس کا ہر فرد فضولی فضول گوئی اور بربادی کے ہنر میں طاق بھی ہے اور اور دروازہ بھی مثلث مثلاً ہم سے جب ان مولا مشکلکشا علیؑ قسم کے لٹھ بند فقیروں نے دریافت کیا کہ آپ جبل پور کیوں جا رہے ہیں تو ہم نے ادب سے عرض کیا کہ۔

"مرشد دعا کیجئے میں جبل پور ہاکی کھیلنے جا رہا ہوں۔"

تو ان کا بہرہ کرامات کھل گیا اور روحانیت کے جملہ مراتب طے کر کے

ایک لمبی لاٹھی والے مرشد بولے کہ

بچہ مولا علی تیری مدد کریں گے تو جب کھیل کو جائے تو جبلپور کی درگاہ مداری پر حاضری دیتا جانا"

اس پر ہم نے عقیدتمندی کے لہجہ میں عرض کیا کہ آخر کار ہمیں بھی تو بتا دیجئے کہ اس درگاہ میں وہ کون سی اکسیر اعظم ہے جس کے طفیل ہم ہاکی کے کھیل میں کامیاب ہو جائیں گے۔ تو واقفِ اسرارِ خفی و جلی مرشد نے اپنی گردن میں تسبیح کو گھما کر فرمایا کہ

"بچہ وہاں ایک باوا صاحب ہیں اور اس سے زیادہ ہم کچھ بتانے پر قادر نہیں"

اب جب یہ بھی ہو لیا تو عرفان و معرفت اور اسلام و حقائقِ اسلام کے ان غیر سرکاری ٹھیکہ داروں میں سے ایک نے پورے آدھے فٹ کی ایک چلم نکالی اور ایک نے حکیم اجمل خاں قبلہ مغفور کی حبوب واقع تبخیر کے برابر گانجے کی گولی کو ہتھیلی پر مل کر جو "یا حق" کہا ہے تو آن کی آن میں پورا ڈبا برطانیہ کی دخانی کشتی نظر آنے لگا، اب اس دھواں دھار گانجا نوشی کے وقت ہمارے لئے دو ہی راستے تھے یا ان میں سے ہر ایک کا گلا دبا دیتے یا اپنی ناک کاٹ کر

اشغیریا دے دیتے کہ لیجیے اور اس تعفن کو ہماری ناک نے سونگھ کر اندازہ کیجیے
کہ آپ کیا پی رہے ہیں اور ایک عاشق مزاج اور رنگین دماغ ملاّ رموزی کو
اس گانجے سے کس قسم کا لطف حاصل ہو رہا ہے ؟ مگر سوچا کہ اگر گانجے سے
اظہار بیزاری کرتے ہیں تو ان گداگروں کی گفتگو سے محروم رہ جائیں گے
اس لئے پہلو بدل بدل کر دھواں بچاتے رہے تو ان کی رنگین داستانیں
جاری رہیں کہ اچانک مرشد نے چلم سے خاک اٹھا کر ان الفاظ کے ساتھ
ہمیں عطا کی کہ لے علی کے شیر اسے پھینکنے وقت پان میں کھا لینا پھر دیکھنا فقیری
باشا کا اثر ہے ـ

ہم نے فوراً اس خاک کو آنکھوں سے قریب کیا تو گداگروں کو یقین
ہو گیا کہ ملاّ رموزی اُن کا معتقد ہو چکا لہذا پھر چلنے دیجئے اس "عمل سوختہ"
کا دور۔ اب خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی بیس تیس مریض ایسے بتلائے گئے
جنھوں نے "اِن مرشدین راہِ چلم و گانجا" کی خاک سے شفا پائی اب ہمیں
حیرت تھی تو یہ کہ جب ان مرشدین کامل کی چلم میں خاکِ شفا بخش دن میں
ہزار بار تیار ہوتی ہے تو پھر ہمدرد دواخانہ دہلی" اور" یونانی دواخانہ دہلی
کی کیا ضرورت ہے جو ان پر لاکھوں روپیہ برباد کئے جا رہے ہیں ؟

غرض اِس قسم کی واہی تباہی باتوں کے بعد اصل فقیری اور خدا رسیدگی کا اظہار اس وقت ہوا جب چاروں ہر دانِ منزل سلوک و عرفان ہوشنگ آباد اسٹیشن تک مطمئن ہو گئے۔ کہ ملا رموزی بھی اسی قسم کا کوئی ایم۔ اے پاس افسر ہے جو اپنی بہو بیٹیوں تک کو برکت حاصل کرنے پیروں اور ولیوں کی خدمت میں بھیجا کرتے ہیں لہذا جب یہ لوگ ریل گاڑی سے اترنے لگے تو ایک نے ہم سے آہستہ سے کہا کہ

لا بچا کچھ فقیروں کا حصہ بھی دیدے تاکہ صبح کو یہاں سے آگے کا ٹکٹ خرید لیں۔

تب ہم نے کہا کہ یہ حصہ تو وصول کیجئے آپ تحصیل داروں سے کہ کہ انہی کے ہاں اس قسم کے حصے وصول ہو کر آتے رہتے ہیں البتہ یہ دیکھئے کہ اب ہم آپ کی گت بناتے ہیں؟ اب جو یہ کہا تو فقیر صاحب کے حواس خراب ہو گئے اور فوراً پلیٹ فارم کے اُس دروازہ کا رُخ کیا جدھر سے بے ٹکٹ مسافر بھاگا کرتے ہیں۔

کھٹ ٹک

اب یہ یقین آ ہی گیا کہ دنیا کا لاجواب سے لاجواب شوہر اپنی دنیا کی

بد سے بدتر ہوئی سے ہمیشہ کے لئے جدا نہیں رہ سکتا۔ تو اچانک بستر باندھ
دینا پڑا۔ اتفاق کہ بھائیوں کی ہاکی والی جماعت بھی اسی وقت سفر کر رہی تھی
رات کے ایک اوپر گیارہ بجے جبلپور سے ریل روانہ ہوتی ہے۔ آج کئی دن
کی شدید گرمی کے بعد شام کو ایک خوفناک اور دماغی سکون کو برہم کر دینے
والی آندھی کے بعد قدرے بارش ہو جانے سے موسم میں وجد و کیف کی جو
شرابیں بھر دی گئی تھیں۔ ان کے اثر سے آج کی رات رندوں کے حق میں تیز
پلانے والی رات ہو گئی تھی۔ اس رات ہواؤں میں جو لطافت و نزہت
اور فرحت و شادابی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے دل و دماغ میں نشاط خیال
و سرمستی کے جو ولولے پیدا کر دیئے تھے ان کا لطف وہی لوگ کچھ خوب محسوس
کر سکتے ہیں جو جہنم زار ہند میں چار مہینے کے لئے جھونک دیئے جاتے ہیں۔ یہ
کہاں کا غریب اگر لو سے مر جائیں تو اخباروں میں تعداد چھپا دو۔ اور سرکاری دفاتر کو
شملے کی برفانی بلندیوں پر منتقل کر دو۔

ابھی بارش ہو رہی تھی اور ملا رموزی سیٹھ احمد فرحت کے
دولت کدہ پر بیٹھا تھا۔ کہ یکایک اس نے اپنی روانگی کا اعلان کیا۔ کچھ شکایتاً
کہ اس اعلان سے سیٹھ صاحب موصوف مولانا امیر اللہ صاحب آبسرا اور

مولانا غلام جیلانی صاحب کو بے حد افسوس ہوا۔ انہوں نے ازراہ خلوص وکرم اسٹیشن تک ہمراہ رہنے پر اصرار کیا۔ مگر ہم نے اسے منظور نہ کیا۔ البتہ برادر گرامی ڈاکٹر اعظم کریوی ایڈیٹر رسالہ "اکبر الہ آباد" نے کسی طرح نہ مانا۔ اور برساتی سوٹ پہن کر یہ کہتے ہوئے ہمراہ ہو گئے کہ ؎

آں نہ من باشم کہ وقت ریل بینی پشت من

اب جو ڈاکٹر اعظم ایسا رنگین دماغ ہم پیشہ اور نکتہ سنج اہل قلم ساتھ ہو گیا تو جبلپور میں آج جو ہلکی بارش ہو گئی تھی اس کا حیات آرا لطف حاصل ہو گیا یعنی اس بارش نے آج کی رات کو خنکی اور طراوت تازگی اور شادابی کے جشن حسن وشباب سے آراستہ کر دیا تھا اس کی لطافت افزا کیفیات کا مزا اسی طرح مل سکتا تھا۔ کہ حسن وجمال کے تذکروں میں کوئی ہم خیال وہم مذاق اس طرح شریک ہو کہ

ہم کہیں کہ آج لوگ اس طرح کوٹھوں پر سو رہے ہوں گے کہ بجلی کے لیمپ سرہانے ہوں گے۔ اور کچھ کتابیں اور رات کی اس خنکی سے جو گہری نیند آئی ہو گی تو اس کے اثر سے دوپٹہ مسہری سے نیچے لٹک رہا ہو گا۔ مگر سونے والے کو خبر بھی نہ ہو گی۔ تو ساتھی کہے کہ غلط غلط بلکہ کوئی آج اس طرح

سو رہا ہوگا کہ اس کے منہ پر ملا رموزی والا اخبار "تازیانہ" پڑا ہوگا۔ اور وہ ملا کے مضمون کو پڑھتے پڑھتے ہی سو گیا ہوگا۔

کچھ شک نہیں کہ ہم اور ڈاکٹر اعظم اس بارش سے اتنے ہی پر کیف تھے کہ اسٹیشن تک حسن انسانی سے لے کر جمال فطرت کی وجد آفریں نگارآرائیوں کی لاکھوں تبصرے کر گزرتے۔ مگر برا ہوا احساس و شعور پر تنگ دامنی اور حرمان نصیبی کا کہ اس وقت ہم دونوں کہنا تو چاہتے تھے یہ کہ آؤ ہم تم ان شاداب ہواؤں کے مستی پیدا کرنے والے جھونکوں میں بیٹھ کر خط لکھیں جس کا خلاصہ صرف یہ ہو کہ تمہیں خبر بھی ہے کہ ہواؤں کی ان شادابیوں نے اصحاب درد ارباب ہوش کے کتنے افسردہ ارمان پھر سے شاداب کر دیئے ہیں۔ مگر دونوں کے منہ سے جب نکلتا تھا تو یہ کہ اُفوہ ملا صاحب نہ پوچھئے اِن بے دردوں کی ہم ایسوں سے بے مہریاں؟ اور ہم کہتے تھے کہ جی ہاں۔ ڈاکٹر صاحب سچ ہے کہ گورے کو کالی اور کالے کو گوری بیوی دیئے جانے کا قاعدہ اور آرڈیننس بیا جو جاری ہو چکا ہے وہ بدلا جا سکتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اُسے بدلے کون؟

غرض بارش کی خنکی اور جبلپور کی ٹھنڈی اور کشادہ سڑکوں پر جب تک چلتے رہے اُس وقت تک شعر و ادب اور حسن و جمالیات ہند پر وہ وہ تبصرے

اور وہ تنقیدیں ہوئی ہیں کہ اگر ہم دونوں کی اس وقت کی باتوں کو کوئی لکھتا جاتا تو وہ ادب اردو اور زبان اردو کا ایک ایسا سرمایہ ہوتا کہ جو دیکھتا دنگ ہو جاتا اور جو سنتا وہ شیریں فرہاد کے قصوں کو بھول جاتا کہ۔

ناگاہ ریلوے اسٹیشن جو نظر آیا تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ سی۔آئی۔ڈی کا کوئی بڑا انگریز افسر ہمارے کان میں کہہ رہا ہے کہ اچھا بس ملا صاحب اب یہ اپنی تمام خوش دماغی اور مستی تو چھوڑ جائیے۔ ہمارے پاس اور ہاتھ ڈال کر جیب میں یہ دیکھئے کہ تھرڈ کلاس ٹکٹ کے دام بھی ہیں یا نہیں؟ اس لئے فوراً ہی ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ ٹکٹ لے آئیے۔ میں بستر لے کر پلیٹ فارم پر چلتا ہوں۔

ٹکٹ جو آگیا تو اب ہونے دیجئے ہجر و فراق اور جدائی کے افسردہ کن تذکرے۔ مثلاً ڈاکٹر فرماتے کہ آہ ملا صاحب آپ کے آنے سے میرے اندر جو بہرے جوانی آگئی تھی تو اب آپ کے جانے سے میں پھر خضاب لگانے کے قابل رہ جاؤں گا۔ اور ہم کہتے تھے کہ کچھ شک نہیں ڈاکٹر صاحب اب جو ہم وطن میں داخل ہوئے کہ ہونے دیجئے ہم سے یہ لطافت سوز سوالات

کہیے کیا لائے۔

جی ہاں اب تو خاصی آمدنی ہو رہی ہے۔ کتابوں سے ؟ وغیرہ

پلیٹ فارم پر ابھی اس قسم کے خیالات دماغوں کو برباد کر رہی تھے کہ
کہ ایسا محسوس ہونے لگا کہ سبز ریشم میں ایک سفید سی چیز کو چند انگریز
اس مستی و خرمی اور فاتحانہ تبسم کے ساتھ اپنے حلقہ میں لئے ٹہل رہے ہیں
کہ کالے آدمی دیکھیں اور دل تھام کر پلیٹ فارم پر بیٹھ جائیں۔ یہ سفید سی
متحرک بجلی جس طرف چمک جاتی تھی بڑے بڑے انگریز ٹوپیاں اُتار کر
اُسی طرف جھکے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس کے پاس سے سینٹ کی جو
مہک اور خوشبو اڑتی تھی اس نے پلیٹ فارم پر چلنے والی ہندوستانی
ہواؤں کو پرستان انگلستان کی عنبر فشانیاں اور عطر بیزیاں بخش دی تھیں
اونچی ایڑی کے سیاہ جوتے کی کھٹ کھٹ پر نظر پڑتی تھی۔ تو ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ ایک سرو گلستان ہے جس کے قد رعنا میں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے
موجیں پیدا کر رہے ہیں اور قریب ہے کہ پلیٹ فارم تہ و بالا ہو جائے چنانچہ
ہم نے بھی اپنی خواہ مخواہ کی ملائیت کو بستر کے پاس رکھ کر جب خواجہ حسن نظامی
قبلہ کی حسن پرور نگاہ سے دیکھنا شروع کیا تو یہ محققانہ نکتہ سمجھ میں آ ہی گیا

کہ گلستانِ فرنگ کی یہ نیلگوں چشم قمریاں اور ریشمی تتریاں کچھ تو اس لیے
خوش خرام اور حسن لبالب نظر آتی ہیں۔ کہ وہ ایک سرد و معتدل خطے کی پیداوار
ہیں۔ مگر یہ جو ہندوستانیوں کی نظر میں مجموعہ جمال و محبوبیت نظر آتی ہیں
سو اس لیے کہ ان کے مالک خود انہیں اتنا زیادہ لچک دار بنا کر پھراتی ہیں
کہ دیکھئے اور منہ پانی سے "خواجہ دہلوی" کی طرح کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر رہ جائیے۔
اور اب ہمیں گلستان و گلستاں نمونوں کو دیکھ کر یہ اپنے خطر زدہ ہندوستانی
چاہتے ہیں کہ اپنے قومی کالجوں اور اسکولوں سے بھی ایسی ہی کرتی دار
تتریاں اڑائی جائیں جو اپنے گنگا جمنی انداز سے لندن زادیوں پر آوازہ
کس سکیں کہ آؤ اور اپنے حسن بے قید و جمال بے محابا سے ہمارے بنائے ہوئے
اور شرمیلے نمونوں سے مقابلہ کرو۔ پھر دیکھو کہ ایشیا کا ساتھ چاند سورج کو
شرمانے والے چہرے پر پڑتا ہے۔ یا ہماری گندمی ملاحت پر جا پڑتا ہے۔
فی الجملہ ہم نے طے کیا کہ پلیٹ فارم پر اس "اچھی اور سیدھی" نسوانیت کی عزت
بڑھانے والے کو اگر دیکھنا ہی ہے تو یوں دیکھو کہ ہندوستان کی نانی ہوئی
پرہیزگاری بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ اور نظر بازی کی بھی ایسا ہو کہ پھر نظر
اس زرق برق انسان ہی میں جذب و پیوست ہو کر رہ جائے۔ اس لیے کچھ

بڑے ہی نمازیوں کے انداز سے ایک چائے کی دوکان پر کھڑے چائے
پیتے رہے اعظم بے چارے نہ کسی کے جھانکنے میں ہیں اور نہ کسی کی تاکنے میں
بس کھڑے چائے پی رہے ہیں اب اتنے میں اگر ادھر ادھر کبھی کبھی دیکھ بھی
لیتے ہیں تو کہاں کا گناہ کرتے ہیں۔

وہ تو ہوش اس وقت آیا جب وطن اقدس لیجانے والی ریل گڑگڑاتی
ہوئی سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ اور ہندوستانی مسافروں کے بستروں اور
صندوقوں کا دنگل شروع ہوگیا۔ اب قریب قریب ہر مسافر اس فکر میں تھا
اس اکیلے کو ساری ریل سونے کیلئے مل جائے۔ مگر ہم اس غم میں گھرے تھے
کہ آہ زبان اردو کے کسی نصف نظام دکن ہی نے آج اس قابل تو بنا دیا
ہوتا۔ کہ جس فرسٹ کلاس میں یہ بتان فرنگ سفر کرتے ہم بھی اسی فرسٹ
کلاس میں ڈٹ جاتے مگر وہ جو جبلپور اپنے ہی کرایہ سے لے گئے تھے اور
اپنے ہی کرایہ سے واپس ہو رہے تھے۔ تو اس کا پھل یہ ملا کہ وہ قہقہہ لگا کر
اور انگریزی ٹوپیوں کا سلام لے کر فرسٹ کلاس میں اور ہم نے قلی سے کہا کہ
ڈھونڈھ بھائی کوئی بدبودار مہاجنوں اور کسانوں سے بھرا ہوا تھرڈ کلاس
اس وقت ڈاکٹر اعظم کریوی کو جو بذلہ سنجی سوجھی تو ہمارے تھرڈ کلاس میں

بیٹھ جاتے اور ان کے فرسٹ کلاس میں بیٹھنے پر انہوں نے یہ آوازہ کسا کہ
اور قہقہے اور شادمانیاں پیدا کیجیئے اردو زبان کے بے حس پڑھنے والوں میں
اس سے تو عجب خاں سرحدی ہی کی زبان کے ادیب ہوتے تو آج مس بازی
میں یوں ناکام دیدہ تو نہ رہتے۔ غرض اس آوازے سے جہاں اردو کے
شگفتہ نگاروں کی واماندگی پر افسوس ہوا۔ وہاں ڈاکٹر اعظم ایسے صحبت
ذوق و نکتہ سنج دوست کی جدائی کا غم لیکر روانہ ہوگئے۔

اب تو ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ ہندوستانی ریلوں کے
تھرڈ کلاسوں میں کیا ہوتا ہے۔ اور کیا ہوتا رہتا ہے۔ بس یہی کہ تو آیا اور
میرے پاؤں پر بستر رکھ کر بیٹھ گیا۔ اور میں آیا اور تیرے منہ پر پاؤں پر
رکھ کر سو گیا۔ ادھر ریل کے تھرڈ کلاس کا کرایہ تو جتنا ریلوے کمپنی چاہتی ہے
ہر سال بڑھا دیتی ہے اور کونسل کے ارکان اُسے ڈانٹ بھی نہیں سکتے
مگر کرایہ پر کرایہ بڑھا دینے کے بعد بھی تھرڈ کلاسوں میں نہ بجلی کے پنکھے بڑھائے
گئے نہ اتنی تیز روشنی کی جاتی کہ کوئی لکھا پڑھا مسافر رات کو نیند نہ آنے سے
کچھ بیٹھا پڑھتا ہی چلا جائے۔ لہٰذا دو چار اسٹیشن تک تو رات کو ٹھنڈی ہوا
اور کچھ مطلب کے موافق اشعار گنگناتے چلے گئے اور اس کے بعد ڈیڑھ فٹ

جگہ میں لیٹ کر سوتے وقت کی توبہ استغفار کو یوں پڑھتے رہتے ۔ گویا سارا دن گناہوں اور سیہ کاریوں ہی میں گذرا ہے ۔ حالانکہ جبل پور کی ایک ایک ٹھنڈی سڑک سے پوچھ لیجئے جو کسی ایک کو بھی دل بھر کے دیکھا ہو؟

القصہ کسی نہ کسی طرح اٹارسی جنکشن پر پہنچے ۔ رات بھر اسی طرح سوئی تھی کہ نیند اور بیٹھی نیند کے عوض ایک بیہوشی سی طاری ہو جاتی تھی ۔ کیونکہ دس پندرہ منٹ کے بعد پاس والے مسافر کے سر سے سر ٹکرا جاتا تھا ۔ اور کبھی پاؤں نہ پھیلانے سے جو درد پیدا ہو جاتا تھا اس کی تکلیف سے آنکھ کھل جاتی تھی یہی حال گاڑی ٹھہرنے والے اسٹیشنوں پر ہوتا تھا ۔ کہ ادھر تو ہم بیٹھے خواب میں دیکھنے لگے کہ ایک پری پیکر پری وش اور پری جمال سرہانے کھڑی کہہ رہی ہے کہ اُف ملا رموزی ایسا شگفتہ نگار اور بہار افروز قلم کا مالک اور مجھ سے اتنا دور ؟ کہ اچانک مسافروں کی یلغار ہوئی ۔ کہ کوئی ہے کہ سر کے پاس ہی اپنا بڑا سا صندوق یوں رکھ رہا ہے گویا اس کے جی میں ہے کہ ہر سونے والے مسافر کا سر توڑ ڈالے ۔ کوئی ہے کہ گٹھڑیوں پر گٹھڑیاں ہے کہ ڈبے میں بھرتا چلا جا رہا ہے ۔ کوئی ہے کہ مع بیوی کے اس طرح آکر ڈٹ گیا ہے کہ بیوی کی بغل میں بھی ایک بچہ ہے تو گود میں بھی

ایک بچہ پھر ان بچوں کو ریل میں نہ نیند ہے نہ موت ۔بس سونے والے
مسافروں کے سر پر ہیں کہ بے تحاشا رو رہے ہیں اور سلیقہ یہ کہ اکی ماں اس
چیخ پکار پر بھی اس گھمنڈ سے پڑی سو رہی گویا یا تو وہ حسن و رنگینی اور جمال لطافت
کی کوئی دوسری نورجہان ہیں ۔کہ انگریز بھی اگر سوتا دیکھ لیں تو کچھ نہ کہہ سکیں گے
یا پھر دہقانی بدتمیزی کا آخری ثبوت ہے کہ اولاد چاہے تمام راستہ چیختی نہ
جائے ۔مگر جو سوئی ہیں تو سوتی ہی رہیں گی نتیجہ یہ نکلا کہ اٹارسی جنکشن پر
کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک بیٹھے اونگھتے رہے ۔مگر اس اونگھنے سے زیادہ تکلیف
دہ تصور یہ تھا کہ اب اٹارسی سے گھر تک جو پھر تھرڈ کلاس میں جائیں گے
تو اس طرح کے مسافروں سے پھر سابقہ پڑیگا جو تمام راستہ بیٹھے اونگتے
تو رہیں گے ۔مگر ان کے اندر ہنسی مذاق دل لگی تفریح اور زندہ دلی کی
کوئی علامت موجود نہ ملے گی کہ غلامی کے مارے ہوئے دماغ زندہ دلی اور
مسرت کے ہر جذبے سے ہمیشہ خالی ہوا کرتے ہیں یقین نہ ہو تو فاتح انگریزوں
کے سولجروں کی اسپیشل ریلیں دیکھا کرو جن میں سفر کرنے والے سولجر
زندہ دلی ۔مستی تفریح اور خوش مذاقی کا نمونہ ہوا کرتے ہیں ۔مگر ان کے
مقابل تم جس مرتبے کے ہندوستانی کے ساتھ چاہو سفر کر کے دیکھ لو۔

بس انشاء اللہ مبلون خشکی اور ماتم کا شام لوٹ بنا چلا جائے گا۔ مگر ایک مرتبہ بھی ہنسنے کی کوشش نہ کرے گا۔ اور دوسروں کو ہنسانے اور خوش دل بنانے کی مقدرت تو ہندوستانیوں کو حاصل ہی نہیں ہوتی۔ اسی لئے ان ان بدمذاقی اور ماتم زدگی کے دلدادہ ہندوستانیوں میں کسی ظریف مضمون نگار کی کوئی قدر ہے نہ کسی پرجوش اہل قلم کی قیمت۔

ناگپور تک

صوبجات متوسط میں زبان اردو کی خدمت سے جب امرائے صوبہ جات متوسط کو بے پروا پایا تو ان کے ذمہ کی اس ذمہ داری کو ملا رموزی اپنا پورا کرنے چلے اور اپنے ذاتی مصارف سے چلے تو ان کا دل گھر ہی سے خون ہونے لگا۔ مگر اس مالی اور ذہنی اذیت کو جب ملا رموزی نے برداشت کر لیا تو فطرت و جمال فطرت کے نزہت آرا مظاہر اس کی تشفی اور ذہنی نوازش کے لئے تیار ہو گئے اور اس طرح خدا کا وعدہ پورا ہونے لگا کہ وہ صابر اور جفاکش بندوں کو آخرکار افسردہ نہیں ہونے دیتا۔

لہٰذا خدا جانے کن تفکرات کو ساتھ لے کر ناگپور میں انجمن اردو کے

سکے لئے ریل کی تھرڈ کلاس میں گنواروں کی کثرت سے اپنے ہاتھ پاؤں سمیٹ کر چوروں کی طرح بیٹھ کر ابھی دو چار ہی اسٹیشن چلے تھے کہ چند مسافر ہمارے ڈبے میں آئے۔ اور سامنے والی نشست پر بیٹھ گئے۔ ان کی ساتھ ایسا معلوم ہوا کہ کوئی ریشمی گٹھڑی بھی ہے جو کونے میں رکھ دی گئی ہے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ زرتار و زرنگار چیز ہمیں دیکھ رہی ہے اور اس انداز سے گویا وہ چاہتی ہے کہ اگر اس کے ساتھی نہ دیکھ سکیں۔ تو ٹکار موزی بھی اس کی طرف دیکھتا رہے۔ بشرطیکہ وہ نزاکت و نفاست۔ حجاب و شباب حسن و دلنوازی اور جمال و عشوہ گری کا کوئی عالم آشوب نمونہ دیکھنا چاہتا ہے اب بظاہر تو اس نمونہ کیا دیکھا و حجاب اور جمال و شباب کے دیکھنے میں کوئی چیز مانع نہ تھی۔ الا تھرڈ کلاس مسافروں کا خوف کہ کہیں وہ ٹکار موزی ایسے شائستہ صورت مسافر کو نہ دیکھ لیں کہ وہ ایک جمال و شباب اور حسن و رنگ میں ڈوبے ہوئے اور زرتار و زرنگار لباس والے مسافر کو کیوں گھور رہا ہے۔ اس لئے ہم نے چاہا کہ اس طرف دیکھیں تو ضرور مگر اس انداز سے گویا ہم خود تو دیکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ نظر اٹھتی ہے تو اسی گہوارۂ حسن و شباب

کی طرف۔ ریل کی حرکت سے یوں جنبان نظر آتا تھا۔ گویا ساون کی جھولے میں کوئی ہے۔ جو مست و بے پروا ہو کر جھول رہا ہے۔ اب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہم تھوڑی دیر تک گھور لینے کے بعد تھرڈ کلاس کے لٹھ بند مسافروں کے ہنگامے اور چلم بازی سے تنگ آکر سو جاتے۔ مگر قابل بیان نہیں ہماری وہ بے بسی کہ جب اس طرف دیکھتے تھے۔ تو دیکھتے تھے حنا۔ کہ رنگ سے رنگین انگلیاں برائے نام گھونگھٹ کو پکڑے ہیں۔ اور شرم و شوخی میں ڈوبی ہوئی آنکھیں ہمیں دیکھ دیکھ کر اشارے کر رہی ہیں۔ کہ خبردار جو سوئے ہو۔ یا نظر ملانے میں کمی کی ہے۔

اب تو دل کی دھڑکن اور نظر کے اضطراب کا یہ عالم کہ جی چاہنے لگا کہ وہ انجمن اردو ناگپور بنے یا نہ بنے ہمیں چاہئے کہ بے ٹکٹ ہی اس مجموعۂ بہار و شباب کے ساتھ وہاں تک جائیں۔ جہاں اسے جانا ہے۔ بس اگر ہو گا تو یہی کہ ہمارے خلاف اغوا کا مقدمہ چلے گا۔ اور سارا ہندوستان کہے گا۔ کہ لیجئے وہ ملّا رموزی صاحب بڑے پاکباز بنے پھرتے تھے ایں! اگر یہ ہو گا تو ہم بھی رہا ہو کر یہ سوال چھپوا دیں گے کہ آپ کی قوم نے اپنے شگفتہ نگاروں کے لئے کہاں کی رنگینیاں اور آسودگیاں جمع فرما دی ہیں

جو وہ مست ہو کے مسرور رہو کر آپ کی تفریح طبع اور زبان اردو میں حسن ادب کے
جواہر فراہم کرتے رہیں ؟

ابھی انھی خیالات میں غرق تھے کہ "پاسبان" سو گیا اتفاقاً اس
طرف سے آزادی کی ایک تبسم ریز انگڑائی لی گئی جس کا یہ مطلب تھا کہ اب
"نظر بازی" آسان ہے۔ مگر بُرا ہو اس مروجہ تہذیب و شائستہ خیالی کا کہ
حوصلہ نہیں ہوتا تھا۔ کہ جی بھر کر دیکھ تو لیں۔ مگر اس طرف یہ بے باکی یہ بے حیائی
گویا کوئی بیٹھا مُلا رموزی کو اپنے اندر جذب کر رہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ کوئی دس دس
منٹ کی کوشش کے بعد ہم نظر کو ہزاروں تدبیروں سے اس طرف پھیر کر
دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اور آپ ہی بتائیے کہ حجاب و شباب
کی ایک جنت کو کوئی چند منٹ میں کس طرح دیکھ لے مگر اس طرف نظر بازی اور
نظر نوازی کا یہ عالم گویا حسن و رنگ اور شباب و مستی کی ایک دنیا لیے ہوئے
جو ریل میں بیٹھے ہیں سو اسی لیے کہ مُلا رموزی کے خیال و دماغ میں عشق
دل گرفتگی کی ایک آگ لگا دیں تو سہی۔ لہٰذا ہونے لگا کہ گھونگھٹ نے اختصار
اختیار کیا اور حنا بستہ انگلیوں سے ریشم کی دھانی آستین اس طرح ہٹائی
جانے لگی کہ مُلا رموزی کو ایک غرق نور کلائی پر ٹائم کی گھڑی اندر اس کی

نقرئی چین اتنی صاف نظر آنے لگی کہ وہ اپنی جگہ پر کلائی کی اس نزاکت ونفاست پر یوں متوجہ ہو جائے کہ پھر اُسے ریلوے پولیس کے سپاہی بھی ڈبے سے اُتاریں تو نہ اُتر سکے۔

اب جب کلائی اور گھڑی اس بے حجابی سے دکھائی جانے لگی تو بے چین نگاہوں نے یوں گستاخ ہونا شروع کر دیا۔ کہ جب دیکھئے ملا رموزی صاحب ادھر ہی جھکے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ مگر دیکھنے والے نے یہ بھی دیکھا کہ ملا رموزی دریائے نور میں ڈوبی ہوئی اس کلائی کو دیکھ کر جہاں مست و مدہوش ہو رہا ہے۔ وہاں وہ بے چین اور بے قرار بھی ہے۔ تو حسن خموش نے وہ حکیمانہ طریق نوازش اختیار کیا جو بمبئی والوں کا خاص سلیقہ مانا گیا ہے۔ یعنی اب کلائی اور گھڑی کے حسن سے زیادہ حسین مظاہرے ہونے لگے اور اس درجہ کمال حکمت و حجاب سے گویا اس تمام کارروائی میں کسی اہتمام کا دخل ہی نہیں بلکہ جو کچھ کیا جا رہا ہے اتفاقاً اور اضطراراً۔ مگر ملا رموزی کی بے تاب نگاہوں کی تاثیر تھی۔ کہ ان کے حجاب کو بے حجابی سے بدلتی چلی جا رہی تھی۔ چنانچہ اب یہ ہوا اور گویا اچانک ہوا کے جھونکے سے ہوا کہ سر کے معطر بالوں سے گھونگھٹ یکایک گر گیا جسے فوراً سنبھال لیا گیا۔ مگر دل کہہ رہا تھا کہ اگر ملا رموزی کی

نا دیدہ نگاہیں پرستان زادگی کی اس گوہر افروز مثال کے رخِ رنگین پر چسپکے ساتھ جمی رہیں۔ تو یہ گھونگھٹ ایک مرتبہ کیا ہزار مرتبہ اٹھایا جائے گا اور اور ناسم یہ ہو گا کہ کرتی کیا ریل میں تیزی سے آنے والی ہوا سے منہ کھل جایا کرتا تھا۔ چنانچہ مستی اور رعنائی سے دمکتا ہوا گلاب اس گھونگھٹ سے نظر آیا اور اس طرح کبھی کبھی جو کوئی دوسرا مسافر ہمارے ساتھ اس طرف متوجہ ہو جاتا تو تھوڑی دیر کے لئے حسن و رنگ اور شباب و دوشیزگی کی آگ سے اس دہکتے ہوئے گلاب سے چہرہ پر ساری کا ریشمی حجاب طاری کر لیا جاتا تھا۔ اور مسکرا دیا جاتا تھا یعنی اس وقت کی مسکراہٹ کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ میں کیا کرتی تمہارے پاس والا مسافر بھی تو میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس لئے میں نے منہ چھپا لیا۔ تم سے حجاب کروں تو جوانی کی قسم۔

اب یہاں سے دماغ نے فیصلہ کیا کہ یوں تو تھرڈ کلاس مسافروں کے حق میں بڑے اسٹیشن کا آنا اس لئے نعمت ہوا کرتا ہے کہ اتر کر پانی۔ پوری بیڑی۔ سگریٹ۔ چنے دال موٹھ اور مسی لمبی جمائیاں اور انگڑائیاں لے لیا کرتے ہیں۔ مگر آج ہمارے حق میں ہر بڑا اسٹیشن اس لئے رحمت بن جاتا تھا کہ گاڑی کے دیر تک ٹھہرنے اور تھرڈ کلاس مسافروں کی

۱۱۳۳ ۳۳ ۳۳ ۳

قحط زدہ تعداد سے کہیں بوڑھا پاسبان" بیدار نہ ہو جائے۔ مگر خدا سمجھے
ان انگریزوں سے کہ جس اسٹیشن پر جتنے منٹ کے لئے گاڑی ٹھہرانے کا
ضابطہ مقرر کر دیا ہے لاکھ یہ ملا رموزی کہیں کہ جلد گاڑی روانہ کرو کہ انہیں
کچھ کام ہے۔ مگر انگریز گاڑی نہ چلائیں گے۔ بے سمجھ کہیں گے۔

بارے ہم نے یہ کیا کہ جہاں بڑا سا اسٹیشن آیا اور ہم یوں لیٹ گئے
گویا بڑی گہری نیند میں ہیں۔ مگر دل و دماغ کی اس محبوبانہ تار برقی پر قربان
ہو جائے کہ جہاں کسی اسٹیشن پر بہانے کے طور پر لیٹ جاتے۔ اس طرف
بھی ایک سرخ شال اوڑھ کر کوئی یوں لیٹ جاتا کہ اگر کوئی دریافت بھی
کرے تو کہہ دیا جاتا کہ "میں خود سو رہی تھی" مجھے کیا خبر کہ ریل اسٹیشن پر کتنی دیر
کھڑی رہی؟ اب جو ریل روانہ ہوتی تو ہم تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ جاتے۔
مگر اس طرف حجاب چلا کر کہتا تھا کہ اتنی ہی تیزی سے میں بھی اُٹھ کر بیٹھ گئی
تو ملا رموزی سمجھ لے گا کہ میرے ہی دل کی خموش تاثیر سے یہ بھی اُٹھی ہے۔
لہذا اس وقت دیکھتا کوئی اس طرف کی انگڑائیاں، مگر جذبات انگیز جوانی
بُرا ہو کہ ملا رموزی کی خاطر لاکھ بہانوں کے بعد بھی اُٹھنا ہی پڑتا تھا۔ مگر اس
بعد بھی وہ اُٹھنے کی محبوبانہ خفت یوں مٹائی جاتی تھی کہ دیر تک ہماری طرف

دیکھنے کے عوض کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا جاتا تھا گویا کوئی سوال کرتا تو کہدیا جاتا کہ میں اُٹھی ہی اس لئے تھی کہ ریل سے باہر کا منظر دیکھوں مجھے کیا خبر کہ اس ڈبے میں بیٹھے ہوئے "ملا رموزی کون ہیں؟"

اب آپ کا خیال ہو گا کہ یہ رنگین و دلنواز سلسلہ اپنی تمام رعنائیوں اور دلنوازیوں کے ساتھ ایک دل پسند قربت کی طرف بڑھ رہا ہو گا۔ مگر اس حسین انتظار کو ایک آہ پر یوں ختم کیجیے کہ ہماری ریل بدلنے والا اسٹیشن آگیا۔ اور ہم اس لیے یہاں اُتر گئے کہ ریلوں میں ایسے دل شکن سلسلے صرف اسی حد تک چھڑ جاتے ہیں۔ کہ اپنے اپنے شہر کے اسٹیشن پر دونوں کلیجہ تھام کر اُتر جاتے ہیں۔ اور بس۔ لیکن اگر افسردہ دلی اور مایوسیوں سے تھکا ہوا ملا رموزی کسی سفر میں اپنی منزل مقصود چھوڑ کر کسی دوسرے اسٹیشن پر اُتر جائے تو سمجھ لیجیے گا کہ کوئی جادو اثر اشارہ پایا ہو گا۔ اس لئے اُتر گیا تو کیا گناہ کیا۔

اب جمال و محبوبیت کے کسی حور وش ہمراہی سے جدا کر کے جب جی کی مزد در آواز دے کہ اسٹیشن اٹارسی، ناگپور جانے والی گاڑی تیار ہے تو جی چاہتا ہے کہ اس قلی کا گلا دبا کر کہدیا جائے کہ اسے مرگی کا عارضہ تھا۔

خود گر کر مر گیا۔ لہٰذا اُترے اور خدا جانے کس طرف اُترے۔ اور ناگپور
جانے والی پسنجر ٹرین کے قریب پہنچتے ہی اندازہ گیا کہ بغیر وفات حسرت
آیات کے اس ریل سے باہر نہ آئیں گے۔ یعنی یو۔پی میں تعلیم و تربیت
پایا ہوا مُلّا رموزی اصحابِ علم و فضیلت کی شائستگی آموز صحبتوں میں رہنے
والا مُلّا رموزی فطرت و جمالِ فطرت پر تنقیدیں لکھنے والا مُلّا رموزی اور
پری زادوں اور پری جمالوں کے خونریز اشاروں پر مٹنے والے مُلّا رموزی کو
جب آپ مرہٹی زبان بولنے والے ننگ دھڑنگ گنواروں کی ریل میں
بند کر کے فرمائیں کہ جائیے اور ناگپور میں "انجمن اردو" بنا آئیے تو ایمان
کہیے کہ غریب مُلّا رموزی کو اپنی وفات کا یقین ہوگا۔ یا کسی نئی جوانی کا تصور!

لہٰذا ناگپوری پسنجر میں جو بیٹھے ہیں تو دل جانتا ہے کہ ایک ایک لمحہ
اردو کی شاعری کا اس حشر کے برابر کا محسوس ہوتا تھا جس دن حسینان
ہند از لطف پولیس والوں کو ان کے مظالم کا مزا چکھایا جائے گا۔ یعنی پانی جو
برس رہا تھا۔ تو مرہٹی زبان کے یہ گنوار اپنی پانی سے بھیگی ہوئی چٹائیوں اور
کمبلوں سمیت ہمارے برابر اس خوبصورتی سے آکر بیٹھ جاتے تھے گویا ہم بھی
مہاراشٹر کے بُڈھے اور بچے گنوار ہیں۔ پھر اگر یہی ہوتا تو غم نہ تھا۔ کہ تھرڈ کلاس میں

سفر کرنے کے معنی ہی شائستگی اور بلند خیالی کا خون کرنا ہے۔ مگر ستم تو یہ تھا کہ یہ گنوار بن گنوار ہم سے مرہٹی زبان میں اس تیزی سے باتیں کرتے تھے گویا خدا نخواستہ ہماری مادری زبان بھی مرہٹی ہے۔ اب اگر زبان اردو کے مضمون نگار کو کسی دوسری زبان کے حسن و قبح پر کچھ کہنے کا حق حاصل ہے تو صاف کہتے ہیں کہ ناگپور کے ادب نواز بھائی اگر ہزاروں روپیہ نذرانہ دے کر بھی ملا رموزی کو ناگپور آنے کی دعوت دیں تو ممکن ہے کہ ہم محض اس لیے جانے سے انکار کر دیں کہ راستہ میں مرہٹی زبان بولنے والے پھر مل جائیں گے تو پھر کون ہے جو اپنی کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان اردو کی سماعت کو ان سے برباد کرے۔

پُر لطف اور ہمت آزما بات یہ تھی کہ ہم گھر ہی سے ملیریا میں مبتلا روانہ ہوئے تھے۔ اس لیے سر کا درد چاہتا تھا کہ ریل میں آرام ملے۔ مگر ناگپور کے گنواروں نے بھی قسم کھائی تھی کہ جتنی زیادہ تعداد میں ہو سکے گا۔ آج ہی ہم بھی اس ریل میں سفر کریں گے لہذا اٹارسی سے ناگپور تک جتنے چھوٹے اسٹیشن بنائے گئے ہیں۔ ان میں کا ایک ایک اسٹیشن آج جنکشن کا مزا دے رہا تھا۔ اور ہر اسٹیشن سے گنواروں کے قافلے کے قافلے سوار ہوتے تھے۔ یہاں تک

کہ شب کے کوئی تین بجے تک مسلسل بے آرام رہنے پر بالآخر بے ہوش سی ہو گئے جیسے گنواروں نے سمجھا ہو گا کہ ملا رموزی صاحب سو گئے۔

الحمد للہ کہ صبح کے ٹھیک پانچ بجے کوئی بیس پچیس گنواروں کا اس زور سے حملہ ہوا کہ بیدار ہی نہیں۔ بلکہ اٹھ کر بیٹھ جانا پڑا۔ وہ تو غنیمت ہی کہیے کہ ہمارا بستر ذرا خوبصورت تھا۔ اور چھالردار تکیے جن کے رکیسانہ رعب سے یہ گنوار آگے نہ بڑھے۔ ورنہ ان میں کے ہر ایک نے تمام سوتے ہوئے مسافروں کو یہ کہہ کر اٹھا کر بٹھا دیا کہ اب صبح ہو گئی اب زبان اردو کے خلوص سے نہیں بلکہ صبح کی نماز پڑھ لینے کی برکت سے ملیریا کا اثر کافور ہو چکا تھا۔ ایک اسٹیشن پر چائے جو پی لی تو معلوم ہوا کہ ایک عادی چرس نوش کو کسی نے چرس یا گانجے کی ایک پوری چلم پلا دی۔ اس لئے مزاج میں قدرے جولانی جو محسوس ہوئی تو "ریلیائی" "مناظر" دیکھنے میں مصروف ہو گئے

برہان پور میں

برادرم سید حفیظ الدین صاحب شوقی، بی۔ اے نے لکھ دیا تھا کہ برہان پور میں "ملا رموزی" ایک مشاعرہ کے صدر بھی بنائے جائیں

لہذا مُلّا رموزی اپنے گھر میں تو کبھی اتنا خوش دماغ رہتا نہیں کہ وہ کوئی بہار افروز اور محبوب اندوز غزل کہہ سکے۔ ادھر مُلّا رموزی کی شاعری ابھی بالکل ہی تازہ ہے۔ اس لئے اب ریل ہی میں غزل کہہ سکتے تھے۔ تو اول تو تمام رات مسافروں کی علمی تحقیق میں جاگے۔ صبح کو برادرم بشیر احمد جالندھری نے اپنی پرخلوص چائے اور انڈوں سے ثابت کردیا کہ اگر جالندھر سے مُلّا رموزی کو نشہ کا بہت ہے۔ تو حسن صولت جالندھری اور میں بشیر احمد جالندھری اسے رفع کرنے کے لئے پیدا ہو چکے ہیں۔ لہذا چائے نوش فرماتے رہیئے۔

اب اس حالت سے جو پارسل اکس پریس سے از کھنڈوا بہ ہاپوڑ سفر شروع ہوا تو مارے دماغی تھکن کے ایک ایک آدمی کے دو دو آدمی نظر آرہے تھے۔ اور بارش نے جو فردوسی مناظر پیدا کردئیے تھے وہ بھی میونسپلٹیوں کی گندہ نالیاں نظر آرہے تھے جن کا انتظام نااہل ہندوستانیوں سے کسی جگہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے پنسل اور کاغذ ہاتھ میں تھا۔ اور غزل آسمان پر۔

مگر حسن شاعری کہ کھنڈوا سے چل کر جالانی کے اسٹیشن پر نصف گھنٹے

کے لئے ہماری ریل یہ کہکر روک دی گئی۔ کہ کلکتہ میل گزر رہا ہے اس لئے
پلیٹ فارم پر چہل قدمی کو جو اترے ہیں۔ تو ہمارے ہی ڈبے کے برابر
والے ڈبے میں۔ قوم ہندو اور "عمر چودہ سال" ادھر شباب و جوانی
وہ گویا ماہیرے کی نازک ین بوتل میں گلابی رنگ کی شراب بھر دی گئی ہے
اور وہ بھی اتنی تیز جو بوتل توڑ کر اڑ جانے کے لئے بے چین ہے۔ بس پہاڑ
میں گئی وہ ہماری غزل وزل اس بُری طرح ہم کھڑے کے کھڑے رہ گئے
کہ اگر کوئی سمجھ جاتا۔ تو فوراً بد احتیاطی کی دفعہ میں چالان کر دیتا۔

اب جو منٹ دو منٹ میں حواس درست کرکے مرد و مسافروں سے
نظر بچا کر اس طرف دیکھا تو شوخی و جوان، سادگی ہستی اور دلفریبی کا معاملہ
معاذ اللہ کی حد سے گزر چکا تھا، امان وہ ایک مرتبہ نہیں دس مرتبہ تم مجھے
"بد نظر" کہو۔ مگر واقعہ یہ ہے۔ کہ جب دیکھا تو اس طرح کہ بے ساختہ مسکرا کر
نظریں جھکا لیں۔ پھر اگر اتنا ہی ہوتا تو ہم بھی اب رسول سے بے آپ وہ گیا وہ
پھر رہے ہیں۔ استغفر اللہ کہکر رہ جاتے۔ مگر وہاں یہ حال کہ جوانی شرارتوں
در عشوہ سازیوں میں یوں مصروف تھی کہ اگر اس وقت ہم بوڑھے سے
سٹیشن ماسٹر بھی ہوتے تو محبوبیت اور دلنوازی کی ان چار دہ سالہ فسول

سازیوں میں یوں کھو جاتے کہ ہری جھنڈی ہلانا بھول جاتے اور آنے والا
میل کہیں ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ پھر جو لوگ "آنکھ لڑانے" کے اثرات کو
سمجھتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ دونوں میں یہ جذبہ کتنا بیدار ہو جاتا ہے
کہ ایک بے خود بنا دیکھتا رہے۔ اور دوسرا جوانی شباب ہستی، دلبری اور دلربائی
کی تمام شوخیوں سے کام لیتا رہے۔ لہذا یہی ہوا کہ کبھی حنا بستہ انگلیوں سے
ریل کی کھڑکی کے اوپر اس طرح کے نشانات بنائے جانے لگے۔ گویا کچھ لکھا
جا رہا ہے۔ جیسے ملا رموزی کو پڑھ لینا چاہیے کبھی نورانی نفاستوں اور دلنواز
نزاکتوں میں ڈوبے ہوئے ہاتھ کو اس طرح حرکت دی جاتی تھی گویا کہا جاتا تھا
کہ اگر اس اٹھتی ہوئی جوانی کی وجد انگیز و بہا افروز ادائیں پسند ہیں تو میرے
ساتھ میرے وطن تک چلو پھر وہاں سن لیں گے۔ جو تم کہو گے۔ مگر ملا رموزی
اب بھی کسی وزرو وقار الملک زاہد علی بنے کھڑے تھے۔ تو ان کے زہد و تقا
کو اس طرح برباد کیا گیا۔ کہ کسی بہانے سے ریل میں کھڑے ہو کہ ایک انگڑائی
لی گئی جس میں ملا رموزی کی نگاہوں کو اس سینے کے اندر جذب ہو جانیکی
اجازت تھی۔ جس کے اسرار و اثرات کو سمجھ لینے کے بعد اصحاب وجد و کیف
بیان کے قابل نہیں رہتے۔ لہذا سن لیجئے کہ برہانپور کا اسٹیشن آگیا۔

آپریشن

ہندوستان میں انگریزی قوم کے غالب اور حکمراں ہو جانے کے بعد جہاں اور بے شمار چیزیں ہندوستان پہونچ گئیں آپریشن بھی اسی قوم کی لائی ہوئی ایک بلا ہے یا دولت،،

یعنی آپریشن وہ طریقۂ علاج ہے جس میں کوئی خاص سرخاب کا پر تو نہیں ہے بلکہ یہ طریقۂ علاج وہی ہے جو عرب اور ایران کے مسلمانوں کے صدقے صدیوں سے چلا آتا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ عرب اور ایران بھی شاعری میں آپریشن کے لئے جراح فصاد اور مرہم کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور انگریزوں کے ہاں مفتوح قوموں سے جمع کی ہوئی بے شمار دولت کے باعث اس علاج کو بے حد حسین بنا دیا گیا ہے لیکن زخم کو چیرنے اور کاٹنے سے اتنی ہی سوزش اب بھی پڑتی ہے جتنی پرانے زمانے کے فصاد اور جراح کے کاٹنے سے پڑتی ہے، فرق یہ ہے کہ اوس زمانے کے فصاد مریض سے بالکل اور صاف صاف کہدیتے تھے، کہ اگر بہادر ہو شجاع اور دلیر ہو مجاہد اور غازی کی اولاد ہو تو بیٹھے رہو

ہم تمہارے زخم کو چیرتے ہیں اور اس زمانے کے ڈاکٹر کہتے کہ بس اس
لمبی بینچ پر لیٹ جائیے آپ کو معلوم بھی نہ ہوگا ذرا یہ کلوروفارم عرف
بے ہوشی کی دوا سونگھ لیجیے لہذا آپ جب بے ہوش ہو جاتے ہیں تو یہ
لوگ آپ کے زخم کو جتنا اور جدھر سے چاہتے ہیں کاٹ کر رکھ دیتے ہیں
پھر یہی نہیں بلکہ آپ کی بیوی بچوں سے پہلے اسٹامپ پر لکھوا لیتے ہیں
کہ اگر آپ کا مریض ہمارے کاٹنے سے مر جائیگا تو تم لوگ رو رو کر تو مر جانا
مگر ڈاکٹر پر کوئی دعویٰ نہ کرنا، اس کے بعد ان لوگوں کے پاس ان کے
جیتے ہوئے ملکوں سے جو کافی سے زیادہ دولت ملی ہے تو یہ دواؤں
اور کاٹنے پھاڑنے کے اوزار پر خوب روپیہ صرف کرتے ہیں اور ان
عمدہ عمدہ چمکدار نشتروں سے زخم کاٹتے ہیں کہ اگر تکلیف نہ تو ان اوزاروں
کے خوبصورتی دیکھ کر دل چاہتا ہے کہ ان حسین اوزار سے تمام جسم

کٹوا کر پھینکوا دیں مگر یہ بہت سے آفت تک نہ کہیں۔

پہلے زمانے میں فصاد اور جراح کی حالت یہ تھی کہ یہ لوگ ہمارے ہی ملک کے ہوتے تھے اس لئے ہم ان کی عادتوں سے واقف ہوتے تھے اور یہ لوگ ہم سے واقف ہوتے تھے اس لئے جہاں آپ نے کسی جراح سے جھوٹ کو بھی کہہ دیا کہ میرے زخم میں بڑی تکلیف ہے تو جراح خود ہی دوسرے دن آپ کے گھر پر حاضر ہو کر نہایت ادب سے آپ کو سلام کرتا تھا مزاج دریافت کرتا تھا گھر کے تمام بچوں کا نام لے لے کر ان کی خیریت دریافت کرتا تھا پھر دنیا بھر کی باتیں کرنے کے بعد بڑی نرمی سے آپ کے زخم کا تذکرہ شروع کرتا تھا اور لفظ لفظ میں یقین دلاتا جاتا تھا کہ انشاء اللہ معلوم بھی نہ ہوگا اور زخم اچھا ہو جائیگا پھر زخم کو چیر کر جبتک کہ وہ اچھا نہ ہو جاتا تھا جراح روزانہ آپ کے گھر پر اس انداز سے حاضر ہوتا رہتا تھا گویا وہ آپ کے باوا کا نوکر ہے پھر جب آپ کو شفا ہو جاتی تو آپ کو اختیار تھا کہ اس کے صلے میں جراح کو ڈھائی سیر گیہوں دیدیں یا ایک گھوڑا وہ غریب ہر چھوٹے سے چھوٹے انعام پر اٹھارہ مرتبہ سے سوا سلام کر کے چلا جاتا تھا اور آپکے ولی ہوتے

انعام کی دس جگہ تعریف کرتا تھا۔
لیکن یورپ سے جو لوگ ڈاکٹر بن کر آئے تو اول وہ ہمارے ملک کے نہیں تھے نہ یہاں کی وہ زبان سے واقف نہ یہاں کے اخلاق و آداب سے واقف ادھر وہ تھے فاتح قوموں کے ڈاکٹر اون کے پاس ہم لوگوں سے محصول اور مال غنیمت کے نام کی دولت . . . .
بھی خاصی تھی اس لئے آئے بھی تو بادشاہوں کی شان سے لہذا پہلے تو ہم لوگ اون کے زرق برق لباس اون کی موٹروں اور موٹر سائکلوں ہی سے ڈرے۔ پھر اون کی زبان نہ سمجھنے کے باعث اون سے سہم گئے پھر اون کی عادتوں سے ناواقف ہونے کے باعث اون کی ہر بات کو مارے ڈر کے سرکارنا حکم سمجھہ کر کانپنے لگے۔ لہذا ان لوگوں نے جو دیکھا کو ہندوستانی تو صرف ڈرنے لرزنے کانپنے اور مارے وحشت کے دنیا جہان کے ہر حکم کو مان لینے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے تو اونھوں نے بھی دل کھول کر اور جان بوجہ کر نئی نئی عادتیں اور بے ضرورت رعب ڈالنا شروع کیا۔ بس حد ہوگئی کہ ان کے اس طریقے کا یہ اثر ہے کہ آج تک ہندوستانیوں کے شریف اور اونچے گھرانوں کی عورتیں تک ڈاکٹروں کے

نام سے گھبراتی ہیں اور جہاں تک اونہیں فائدہ ہوتا ہے وہ حکیموں کو چھوڑکر ڈاکٹروں کا نام تک نہیں لیتی ہیں۔

یہ تو اوس وقت کا قصہ ہے جب غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے انگریز لوگ پہلی مرتبہ ہندوستان پر قابض ہورہے تھے اور ان کے ملک انگلستان سے نئی نئی چیزیں ہندوستان آتی جارہی تھیں۔

اب جب سارے ملک ہندوستان پر ان کا قبضہ ہوگیا تو اب ہندوستانیوں کو فکر لاحق ہوئی کہ اگر ہم لوگ انگریزوں کی زبان اور اون کی باتیں نہ سیکھیں گے تو مارے بھوک پیاس کے کل کے عوض آج ہی مرجائیں گے تو اب ہندوستانیوں میں سے بھی اکثر نے ڈاکٹری علم پڑھا اور ڈاکٹری شروع کردی مگر چونکہ فطرتاً ہندوستانی انہوں نے جو انگریزوں کی زبان اور اون کی باتیں سیکھیں تو یہ آدھا تیتر آدھا بٹیر بن گئے یعنی لباس اور باتیں تو خالص انگریزوں کی حاصل کرلیں مگر مزاج قدرتاً وہی ایشیائی رہا اس لئے ان کی ہر کام میں ادھورا پن اور الٹا پن پیدا ہوگیا۔ مثلاً جس موقع پر انگریزوں کے ڈاکٹر ہندوستانی مریضوں کو ڈانٹتے تھے یہ بے چارے اپنے آدھے ہندوستانی

اور آدھے انگریزی پن کے باعث اوس جگہ تو رہتے ہیں خموش اور جس موقع پر
انگریز ڈاکٹر محبت اور شفقت کا اظہار کرتے ہیں وہاں یہ ہندوستانی ڈاکٹر
مریض کو ڈانٹ ڈانٹ کر نیم مردہ کر دیتے ہیں اس لیے جس طرح ہندوستانی
خالص انگریز ڈاکٹر کے نام سے بھاگتے ہیں اوس سے بھی سوا یہ ہندوستانی
ڈاکٹروں کو گالیاں دیتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ضرورت کے باعث ان کے
منہہ پر یہ کہدیں کہ ڈاکٹر صاحب آپ کے آنے سے تو گھر بھر کی رونق ہوجاتی ہے
مگر جہاں ہندوستانی ڈاکٹر فیس لیکر گھر گیا کہ بچہ بچہ اسے خوب کوستا ہے ۔
اور سب سے بڑا کمال تو یہ ہے کہ آج تک ۹۵ فیصدی ہندوستانی تو ڈاکٹر
کے حالات اور اس کے قاعدوں سے واقف ہی نہیں، اور اسے اپنے حق میں
بھوت ہی سمجھتے ہیں اور خدا کرے سمجھتے ہی رہیں ۔
القصہ ان حالات میں ہماری جو شامت آئی تو ہم اس قسم کے بیمار ہو گئے

. . . .

کہ آپریشن کی زد میں آنا پڑا یعنی بیمار یہ ہوئے کہ ہمارے چہرہ پر ایک پھانسہ ہو کر
ایک دانے کی طرح خشک ہو گیا اور بس، چونکہ انسان قدرتاً حسن پر حریص ہے
اس لئے چہرے کی صفائی بگڑنے سے ہمیں رات دن غم ستانے لگا، دنیا

بھر کی دوائیں استعمال کیں مگر کوئی افاقہ نہ ہوا، دانا خشک ہو کر اگر غیراذیت رساں ہوگیا تھا مگر جب کسی آئینے کو دیکھ لیتے تھے تو اپنے چہرہ کے بدنما ہونے پر اوتنا ہی غم ہوتا تھا جتنا ایک رنڈی کو اپنے چہرہ کے بگڑ جانے کا صدمہ ہوا کرتا ہے، خلاصہ یہ کہ ہم تو اس دانے کے علاج سے مایوس ہوگئے مگر ایک ذی مرتبہ مہربان نے اس بدنمائی دور کرنے کا ایک یہ طریقہ بتایا کہ آپریشن سے یہ بدنمائی عمر بھر کے لئے دور ہو سکتی ہے، ادہر ہمیں یہ غم ہر وقت ستاتا ہی رہتا تھا کہ اگر ہمارے مضامین کی گلزار افروز لطافتوں اور فردوس آرا رعنائیوں نے بدمذاق مسلمانوں میں ہماری امداد و سرپرستی کا کوئی عملی جذبہ پیدا نہیں کیا ہے تو ہماری صورت کا حسن ہی ہمیں کسی دن اس قابل کر دیگا کہ کوئی اپنے شباب و جمال کی بھڑکتی ہوئی آگ سے دنیا کو جلا دینے والی ہمارے مردانہ حسن و جمال پر سو نہیں تو پچاس جان سے ہمارے اوپر فریفتہ ہو کر ہمارے ساتھ اس طرح فرار ہو جائے گی کہ اپنے مال دار باپ دادا کا ہزاروں روپیہ بھی ساتھ لے گی اور کسی شہر میں جا کر ہمیں کوٹھیاں اور موٹریں خرید کر آزاد کر دیگی تاکہ ہم مالی مشکلات سے فارغ ہو کر پھر وہ لکھتے رہیں جو دنیا کو نئی سرے

سر سے جوان بنا دے۔

اب بتائیے کہ جس شخص کو یہ یقین آجائے کہ اوسے اوس کے اپریشن کے بعد ہی وہ حسن ملے گا کہ اوس پر کوئی مہ پارہ عاشق ہوکر اوسے بمبئی اور کلکتے میں لاکھوں روپیہ کی کوٹھیاں خرید دیگی اور وہ مالی مصائب کے مسلسل عذاب سے نجات پاکر ایک مرتبہ پھر جوان ہو جائیگا وہ آپریشن کے لئے کتنی عجلت اور مستعدی سے کام لے گا۔ مگر اللہ شاہد ہے اس حقیقت پر کہ کوئی ایک سال گزر گیا مگر ہمت نہ ہوئی کہ آپریشن کے لئے تیار ہو جائیں۔

بس جب بھی ارادہ کرتے تھے تو ان خیالات میں ڈوب جاتے تھے کہ اگر آپریشن میں مر گئے تو یہ تو نہ ہوگا کہ ہمارے ضعیف والدین ڈاکٹر ہی کو پھانسی پر چڑھا کر چند لمحے قلبی سکون حاصل کرلیں گے یہ بھی تو نہ ہوگا کہ ہمارے متعلقین کا کوئی سرکاری وظیفہ مقرر کر دیا جائیگا جبکہ بے شمار آپریشنی مردے قبر ہی میں پہونچ گئے مگر تین دن کے سوا اون کا تذکرہ بھی دنیا میں نہ رہا اور بھوکے مرتے پھر رہے ہیں اون کے متعلقین۔

یہ بھی تو نہ ہوگا کہ کوئی انجمن حمایت اسلام قسم کی انجمن ہمارے

متعلقین کا وظیفہ مقرر کردے گی جب کہ پورے ہندوستان میں ایک مجلس بھی اس مقصد کیلئے قائم نہیں ہے جو اردو کے بے زر و مال خدام کے متعلقین کو پنشن دینے کے لئے بنائی گئی ہو، اچھا یہ کچھ بھی نہوا بلکہ ہمارے عیوض خود ڈاکٹر ہی مرگیا اور ہم اچھے ہوگئے تب بھی یہ تو یقینی بات ہے کہ آپ رے شن ہونے پر خدا جانے ڈاکٹر کس قسم کا اور کن چیزوں سے پرہیز کرنے کو کہے گا اور ہم سے نہ ہو سکا تو ؟

کیونکہ انسان کی یہ مانی ہوئی عادت ہے کہ وہ لفظ پرہیز کی خلاف چلتا ہے اور ایک بیماری کے زمانے والے پرہیز ہی کا کیا جس جگہ اور جس بات سے پرہیز کو کہئے۔ انسان اور اوس کی بیوی وہی کرتا ہے اور وہی کرتی ہے جس سے ان دونوں کو منع کیا جائے وہ دیکھئے نا کہ آج کل کی . . . . نوجوان لڑکیوں کو جو معلوم ہوگیا ہے کہ پہلے زمانے میں شادی ہوجانے سے پہلے اشراف اپنی لڑکیوں کو آرائش اور فیشن کی نزاکتوں سے دور رکھتے تھے تو اب دیکھ لیجے کہ لڑکیاں اسکول بھی جاتی ہیں تو ریشم اور سلک کے برقعے اوڑھ کر چشمے سینٹ اور پاؤڈر لگا کر، پمپ اور فیشنی چوڑیاں پہن کر پھر ان لڑکیوں سے

کہا گیا کہ شادی ہو جانے سے پہلے کنواری لڑکیاں گھر کے دروازہ کے پاس بھی نہیں آتی تھیں تو اونہوں نے یہ کیا کہ شہر لاہور سے قصبہ ماڈل ٹاؤن تک اور امرتسر سے لاہور تک مردوں کی لاری میں بیٹھ کر جانا شروع کر دیا، پھر انہیں معلوم ہوا کہ پہلے زمانے میں کنواری لڑکیاں دروازہ سے جھانکتی نہیں تھیں تو اب اونہوں نے والد صاحب ہی کے موٹر میں بیٹھ کر جھانکنا شروع کر دیا چنانچہ آپ دیکھ لیجیے گا کہ جس موٹر میں پردے باندھ کر اس زمانے کی لڑکیاں جا رہی ہوں گی وہ موٹر کے پردے اوٹھا اوٹھا کر یا موٹر کے پیچھے والے شیشے میں سے جھانکتی جا رہی ہوں گی اور بعض تو اشارے تک کرتی جاتی ہیں اور موٹر ڈرائیور سے مذاق کرنے سے تو چوکتی ہی نہیں ہیں، پھر انہیں معلوم ہوا کہ پہلے زمانے میں شادی ہو جانے سے پہلے لڑکیاں مہمان تک نہیں جاتی تھیں تو اب اونہوں نے سینما کا تماشہ تک دیکھنا شروع کر دیا اور بعض تو مردانہ لباس میں سینما کے اندر پکڑی گئی ہیں۔

اسی طرح آج کل کے مردوں کو معلوم ہوا کہ پہلے زمانے کے مرد عورت کو زیادہ سر نہیں چڑھاتے تھے تو اس زمانے کے مردوں نے یہ کیا کہ یورپ والوں کی نقل میں اپنی عورت کو موٹر میں سیدھی طرف بٹھانا شروع کر دیا

اوتو او آج کل کے پچاسوں مرد اپنی بیوی کو رات کے وقت مردانہ سوٹ پہنا کر سینما ہیں لے جاتے ہوئے ہم ملا رموزی بقلم خود کے سامنے سے گذرے ہیں اور ہم نے ان کی حماقت پر قہقہہ لگایا ہے اور اپنے ساتھ کے غنڈوں سے کہا ہے کہ تم بھی قہقہہ لگاؤ۔

ہدایت

یہ کتاب اخبارات کو ریویو کے لئے نہیں بھیجی گئی ہے اس لئے کوئی صاحب اس پر اخباری رائے کا انتظار نہ فرمائیں۔

جو صاحب اس کتاب کو کسی ایجنٹ سے خرید فرمائیں اونہیں چاہیئے کہ وہ اپنا مستقل پتہ صاف خط میں لکھکر ہمیں بھیجدیں تاکہ آئندہ ہر نئی کتاب کی اونہیں اطلاع دیجا سکے، کیونکہ اکثر ہوتا ہے کہ جو ایجنٹ اس کتاب کو فروخت کرتے ہیں وہ دوسری کتاب کے وقت ایجنٹ نہیں رہتے۔

ملا رموزی۔ بھوپال،

غرض قصہ کون کہے کہ اب یہ فکر پیدا ہونے لگی کہ اگر آپ روشن ہوجے پر

ڈاکٹر نے کسی چیز سے پرہیز کو کہا تو یقیناً ہم ایسا نہ کریں گے اور گھر والوں کی نظر بچا کر کوئی نہ کوئی چیز ایسی کھا لیں گے کہ آپریشن سے اچھے ہونے سے پہلے کسی دوسرے مرض میں مبتلا ہو کر اگر اوسی دن مر بھی نہ گئے تو کم از کم "مردہ نما" ضرور ہو جائیں گے۔"

اچھا تو یہ بھی سہی کہ ڈاکٹر نے کوئی پرہیز نہ بتایا اور انگریزوں تک کو کھا جانے کے لئے اجازت دیدی تب بھی یہ تو ضرور کہے گا کہ دیکھئے ملاحظہ ہو اب چند دن تک لکھنا پڑھنا بند رکھیئے گا، ہلئے گا نہیں۔ بس لیٹے رہیئے گا کسی دوست آشنا سے ملاقات نہ کیجیئے گا کھانسی کے وقت منہ بند رکھیئے گا زیادہ زور سے قہقہہ نہ لگائیے گا، بستر پر تین تکیوں کے عوض ایک اوپر دس تکیئے لگائیے گا، نہایت صاف اور قیمتی چادر بستر کے اوپر بچھائیے گا تاکہ آپریشن کا حال دریافت کرنے والے آئیں تو آپ کے مالدار ہونے پر یقین کر سکیں بستر کے قریب ہی ایک میز پر تازہ نارنگیاں، سیب، انگور، اس طرح رکھ دیجے گا کہ جی چاہنے پر بھی نہ کھائیگا اور نہ گھر کے بچوں کو کھانے دیجے گا صرف اس لئے ان پھلوں کو رکھ لیجے گا کہ مزاج دریافت کرنے والے لوگ دیکھیں کہ ہاں ڈاکٹر نے آپ کو اتنے قیمتی پھل کھانے کو

بتائے ہیں اسی پھلوں والی میز پر دو چار شیشیاں رکھ لیجئے گا تاکہ معلوم
ہو کہ آپ کو یہ دوائیں پینے کو بتائی گئی ہیں بس اس طرح کی ایک آراستہ
میز کے پاس مسہری لگائے پڑے رہئے گا کہ آج کل کے یورپ زدوں اور
فرنگی پرستوں کے بیمار ہونے اور علاج کرانے کا یہی فیشن ہے ۔

مگر ہم سوچتے تھے کہ اگر ڈاکٹر نے ہمیں ان قاعدوں پر پابند ہونیکا
مشورہ دیا تو بس اتنا تو کرلیں گے کہ ڈاکٹر صاحب کے آنے پر اونہیں سب
کچھہ بتا دیں گے لیکن اون کے جانے کے بعد ہی تمام گھر کے بچوں کو
گود میں بھی بٹھائیں گے اور کاندھے پر بھی، بیوی پر چلا چلا کر غصہ بھی کرینگے
اور مرغا مرغیوں پر بھی لکڑی لیکر دوڑیں گے اور یہ تو کبھی بھی نہوگا کہ ڈاکٹر صاحب
ہمیں دیکھ کر چلے جائیں اور ہم میز پر رکھے ہوئے سیب ۔ انار، نارنگی،
اور کیلوں کو چھوڑ دیں اور ان پر ہاتھ صاف نہ کریں، یہ بھی نہ ہوگا کہ ڈاکٹر
کے جانے کے بعد ہم دوا پینے یا لگانے پر سو نخرے نہ کریں، منہ نہ بنائیں
ایک آدہ گھر والے پر پانی کا گلاس نہ پھینک ماریں، یہ بھی نہ ہوگا کہ
ڈاکٹری دوا نوش کریں اور بستر کی چادر کو خراب نہ ہونے دیں، یہ بھی نہو گا
کہ پرہیز کا کھانا مسہری ہی پر کھاتے رہیں اور باورچی خانے سے کھانوں کی

عمدہ عمدہ ہوائیں اور خوشبو آنے پر ایک مرتبہ بھی باورچی خانے میں جا کر ترکاریاں نہ دیکھیں یہ بھی نہ ہوگا کہ تمام گھر آدھی رات کو سو رہا ہو اور ہم آہستہ سے اوٹھکر باورچی خانے سے کچھہ غیر پرہیزی چیزیں نہ اُڑا دیں، یہ بھی نہ ہوگا کہ بیوی کو پاس بٹھا کر یہ نہ کہیں کہ دیکھو بیوی میرے مرجانے کے بعد تم چاہے بھوکی مرجاؤ مگر میرے لڑکے کو آکسفورڈ یا علی گڑھ بھیجکر انگریزی ضرور پڑھا دینا، اور اگر لڑکا عربی فارسی علوم پڑھنے کی خواہش کرے تو مارے جوتوں کے اوس کا سر توڑ دینا اور اوس سے کہنا کہ تیرے والد مُلّا رموزی کہہ مرے ہیں کہ آج کل کے مسلمان تعلیم یافتہ اوسے کہتے ہیں جو انگریزی زبان اور انگریزی کے کلرک بنانے والے علوم جانتا ہو یعنی کسی تاریخ کا سر تو کسی جغرافیہ کا پاؤں حساب کی ایک آدہ ناک تو سائینس کا ایک آدہ کان بس جب وہ اتنا پڑھ لے تو اوسے لیڈری پر لگا دینا کیوں کہ آج کل ہندوستانی مسلمانوں میں یا لیڈر مزے کرتے ہیں یا افسروں، عہدہ داروں ایم۔اے، پاس لوگوں اور رئیسوں کے پیر صاحب، یہ بھی نہ ہوگا کہ ہم ڈاکٹر کے جانے کے بعد بیوی سے یہ بھی نہ کہیں کہ لاؤ جی آج تو خدا کا حوالہ مجھے انڈے اور کباب تو کھلا ہی دو مگر دیکھو اماں بی سے نہ کہنا۔

یہ بھی نہ ہوگا کہ ہمارے مضامین پر ایک لاکھ جانوں سے نثار ہونے والی کے پیہم خطوط کے جوابات بھی نہ لکھیں خصوصاً جب کہ وہ ہر خط میں ہمیں یہ لکھتی رہے کہ۔

"میرے پیارے مُلّا رموزی!

"خدا کے لئے مجھے زیادہ نہ آزماؤ، مجھے زیادہ بے چین نہ کرو مجھے ہر ڈاک سے اپنی خیریت کا خط بھیجتے رہو، بالکل مطمئن رہو

. . . .

. . . .

. . . . "آہ میرے پیارے

مُلّا رموزی میں دوسرے کے بس کی ہوں اگر آج میں اپنے اختیار کی ہوتی تو بتا دیتی کہ تمہاری صحت تک تمہاری مسہری سے الگ نہ ہوتی، اور تمہاری جوانی پیدا کرنے والی اور غم سے دور رکھنے والی مضمون نگاری کی یہ قدر کرتی کہ بس تم سے جدا نہ ہوتی خیر ذرا صبر کیجئے مجھے مسوری جانے کا موقع ہاتھ آنے دیجئے ایسا بھی ہو جائیگا جیسا کہ مسوری کے زمانے میں ہوتا بھی رہتا ہے

تمہاری اور صرف تمہاری اپنی تصویر بھی بھیج رہی ہوں"

"شوکت عارف"

اچھا سب کچھ مان لیں گے مگر ڈاکٹر کا یہ مشورہ کس طرح مانیں گے کہ روزانہ معاوضہ کے مضامین نہ لکھیں گے کیونکہ اگر ایسا نہ کریں گے تو بھوکے مریں گے کیوں کہ گورنمنٹ کی زبان اُردو تو ہے نہیں جو ہمیں نوبل پرائز بھی مل جائے اور سیر و سیاحت کو جائیں تو گورنروں کی کوٹھیوں میں مہمان رکھے جائیں، اور جن ہندوستانی رئیسوں کی مادری زبان اُردو ہے۔ انہیں انگریزی پرستی اور "پائنیر" پڑھنے سے فرصت نہیں اسی لئے وہ اردو زبان کے اتنے خوشبودار خواجہ حسن نظامی اور اتنے سفید بالوں والے مولانا راشد الخیری تک نئے نئے چندوں اور اپیلوں کے ذریعہ ریاستوں اور امیروں کے ہاں حاضر ہوتے ہوتے تھکے جا رہے ہیں اور نام یہ ہے کہ بڑے با اثر ہیں، اور بڑے ادیب!!!

اماں اور تو اور لوگ ہماری کتابیں صاف ہضم کر گئے مگر انہیں غیرت کا نصف پسینہ بھی نہ آیا، تو ایسی صورت میں مضمون نہ لکھیں تو کیا کوہ ہمالہ پر جا کر بیٹھ جائیں؟

بس جناب یہ خیال جب آتا تھا کہ تنخواہ نہیں، جاگیر نہیں اور تو اور کسی ایسے کی بیٹی نکاح میں نہیں جو آج لیٹے لیٹے آپریشن کے زمانے میں اوس کا قیمتی جہیز ہی فروخت کرکے کھاتے رہتے تو پھر وہ آپریشن کا خیال دل سے نکل جاتا تھا۔

مگر جہاں فیشن ایبل دوستوں میں پہونچتے کہ پھر ہمیں یہ کہکر ڈانٹا جاتا کہ کس قدر گندے آدمی ہو چہرہ بدنما ہو رہا ہے مگر تم سے اتنا سا آپریشن بھی نہیں ہو سکتا، ادھر ہم بھی سوچتے تھے کہ آج کل زمانہ ہی زنانہ قسم کی آرائش کا ہے، چاہے مرد ہو کر آپ گنجے اور گیدڑ ناک سے بھاگ جائیں لیکن اگر آپ فیشن کا چمکدار لباس پہنے رہیں اور ذرا حسین آدمی نظر آئیں تو سب لوگ کرسیوں پر کھڑے ہو کر آپ کی تعظیم کریں گے اس لئے کوئی سال بھر بعد ایک دن ارادہ مضبوط کرکے انگریزی شفاخانے چلدیئے اور سب سے پہلے اوس جگہہ کو معلوم کیا جہاں یہ خوفناک کام ہوتا ہے، بس صاحب جو ملازم نے اوس کمرے کو بتایا ہے جہاں یہ مردود اور راندۂ درگاہ آپریشن ہوتا ہے تو چاہو جس کی قسم لے لو کہ ہاتھ پاؤں قابو کے نہ رہے اور یاد ہی نہیں کہ دل میں کس قسم کا بہانہ لیکر جو گھر آئے ہیں تو الحمدللہ مہینوں اوس طرف کا

رُخ بھی نہ کیا۔

اماں غضب خدا کا کوئی ڈہائی سو قسم کے نشتر تھے کہ صاف صاف الماریوں میں اس خوبصورتی سے جمے ہوئے تھے گویا شفاخانہ کیا ہے نشتروں کے حسن کی نمائش گاہ ہے، اسی طرح کوئی نو سو نوے قسم کی چھوٹی بڑی چھریاں اور خدا جانے کس کس قسم کے آلے تھے جو ان نشتروں کے پاس رکھے ہوئے تھے مگر تھے سب کے سب کاٹنے چیرنے اور پھاڑنے والے، بس تاؤ تو اس بات پر آرہا تھا کہ تھے تو تمام اوزار حد سے سوا صاف اور حسین مگر تھے سب کے سب نوکدار اور دہار والے، بھلا بتایئے کہ انسان کے زخم کو کاٹنے اور پھاڑنے والے اوزار اور آلات کو اتنی خوبصورتی جما کر رکھنے اور پھر وہ بھی شیشے کی الماری میں رکھنے کی کیا ضرورت ہی اچھا اور جو یہ بھی تھا تو اتنا ہی کیا ہوتا کہ ہر آلے پر اتنا پرچہ لکھکر لگا دیا ہوتا کہ ساختہ مراد آباد قیمتی نو روپیہ دس آنے" تو یہ ۹۵ فیصدی غیر انگریزی داں ہندوستانی سمجھہ لیتے کہ اس شفاخانے میں ممکن ہے۔ مراد آباد کے برتنوں اور آلات کی دکان بھی ڈاکٹر صاحب نے اپنے نفع کے لئے کھول لی ہے اور یہ تمام آلے اسی دکان کا مال ہوں گے ،

مگر جناب انگریزی شفا خانے کے اس قاعدہ کو دیکھ کر یہ سمجھے کہ ان نشتروں کو
اتنی خوبصورتی سے سجا کر رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ اصل میں انگریزی علاج
کچھ بھی نہیں ہے اس لئے اوس کے اوزار کو حد سے سوا حسین بنا کر مریضوں
کو اوسکی طرف مائل کیا جاتا ہے اور ہر ہندوستانی ویسے ہی بے وقوف
ہوتے ہیں پس اس ظاہری چمک دمک سے دہوکہ کھا جاتے ہیں وہ
دیکھئے نا کہ لنڈن جاتے تو ہیں تعلیم کے لئے مگر وہاں سے جو میم سے نکاح کر کے
لاتے ہیں تو بس اوس کی ظاہری چمک دمک دیکھ کر ہی مر مٹتے ہیں یا
کچھ اور ؟ ۔

اچھا پھر ایک یہی نہیں کہ اس کمرہ میں صرف ہلاک کرنے والے اوزار
ہی رکھے ہیں بلکہ اس میں عجیب عجیب قسم کی میزیں اور کرسیاں بھی موجود ہیں
مثلاً ایک کرسی اس قسم کی دیکھی کہ اگر خدانخواستہ ہم یا خدا کرے کہ آپ
اوس پر بیٹھ جائیں تو اوس میں آپ کی گردن اس طرح پھنسا دی جاتی ہے
کہ آپ جنبش بھی نہ کر سکیں اور آپ کی گردن تک کاٹ کر پھینک دیجائے
اسی طرح چند میزیں ایسی دیکھیں کہ بس خدا یورپ والوں ہی کو دکھائے یعنی ایک
میز ایسی دیکھی کہ اوس سے بالکل ہی ملی ہوئی ایک میز پر پھر وہی نشتر اور

چاقو نشتے کو رکھے ہوئے تھے جو اپنے منہ سے خود بول رہے تھے کہ اس میز پر
آپ کو لٹائیں گے اور اس میز کے نشتروں سے آپ کو ذبح کریں گے، پھر اور
چلیئے تو جناب ایک طرف سوئی بھی رکھی ہوئی ہے تو دوسری طرف پٹی باندھنے کا
کپڑا بھی نظر آرہا ہے، اب بتایئے کہ مریض اگر نہ بھی سمجھتا ہو کہ یہاں مجھے کاٹا
جائیگا۔ تو یہ تمام چیزیں خود سمجھا دیتی ہیں کہ ہاں ہاں تجھے یہاں کاٹا جائے گا
پھر سب سے بڑی خوب صورتی یہ کہ اس کمرہ میں صفائی اور خوب صورتی تو
جنت سے اونچی ہوتی ہے مگر بدبو اس قسم کی آتی رہتی ہے کہ شفاخانے سے
باہر ہی آپ سمجھ جائیں کہ ہاں انگریزی اسپتال آگیا، پھر کہنے کو تو شفاخانہ
ڈاکٹروں ایسے محققین اور ماہرین مزاج کا گھر ہوتا ہے مگر یہ اتنا بھی تو نہیں جانتے
کہ جس قسم کی خوشبو ہوتی ہے انسان کے دل و دماغ پر ویسا ہی اثر پیدا کرتی ہے
لہذا ہونا یہ چاہیئے تھا کہ شفاخانوں میں عطر اور مشک کی لطیف تر خوشبو
پھیلائی جاتی تاکہ مایوس اور گھبرائے ہوئے مریضوں کے دل پر وحشت کے
عوض فرحت پیدا کرنے والا اثر ہوتا۔ مگر وہ نہیں اتنی نازک اور نفیس عقل سے
کیا کام

بس حد ہو گئی کہ تمام جسم کاٹ کر پھینک دینے والے اتنے بے شمار آلے
اور اوزار ہر ڈاکٹر کے پاس رہتے ہیں مگر سب کے سب بغیر لائسنس کے اور
کوئی ایک مجسٹریٹ نہیں پوچھتا کہ یہ جان سے مار ڈالنے والے ہتھیار جو آپ نے
جمع کر رکھے ہیں تو لکھائیے ان کا حلیہ اور دیجئے سرکاری ٹیکس لیکن اگر
ہم اور آپ لاکھ شریفوں کی اولاد ہو کر لاکھ تعلیم یافتہ ہو کر لاکھ غیر بنگالی
ہو کر بھی ایک دیسی بندوق اور ایک آدھ ریوالور بھی بے لائسنس کے
رکھ لیں تو پھر دیکھئے ان آنریری مجسٹریٹوں تک کا زور، منٹ بھر میں
آپ پر مقدمہ چلائیں اور وہ بھی پوری فوجداری کا پھر ضمانت کے لئے
محلے بھر کے ہاتھ ہی جوڑتے پھریئے ورنہ پکڑ دھرے رہیئے حوالات میں
اور وہ بھی بے روشنی اور کھٹملوں والے حوالات میں"

غرض یہ کمرہ جو دیکھا تو سیدھے گھر آ گئے، وہ تو نفع میں یوں رہے
کہ ابھی آپریشن کا خود ہی ارادہ نہیں کیا تھا اس لئے گھر میں کسی سے تذکرہ
بھی نہیں کیا۔ مگر کب تک پھر جناب کچھ دن بعد دوستوں نے تنگ کیا
اور فیشن ایبل قسم کے دوست تو جان ہی کے دشمن نظر آنے لگے پھر وہ
بھی اپنی مثالیں دے دے کر کہ "

اماں جاؤ بھی کیا خاک تم مضمون نگار ہو کہ اب تک آپریشن ہی کو نہیں سمجھتے، کوئی کہتا!

اماں گنوار ہی رہے ہوئے ہو اب تک کہ آپریشن سے ڈرتے ہو، اوھر ذرا یہ تو دیکھو پارسال میرے اس جگہ ایک پھوڑا ہو گیا تھا خدا کی قسم ایک گھنٹہ تک ڈاکٹر کاٹتا رہا مگر معلوم نہ ہوا اور الحمد للہ اس موذی پھوڑے سے نجات مل گئی پھر تمہارے تو کوئی زخم نہیں ہے کوئی کہتا۔

اماں شرماؤ ذرا تو بچے آپریشن کرا لیتے ہیں مگر تم ہو کہ لرزے جاتے ہو آپریشن کے نام سے کوئی کہتا۔

اماں مرے کیوں جاتے ہو چلو میں لے چلوں تمہیں ڈاکٹر صاحب کے پاس کوئی کہتا پھر ملا رموزی ہی کیوں بنتے ہو؟

گویا آپریشن نہ کرائیے تو ملا رموزی ہو ہی نہیں سکتے، مگر ایک بولے کہ اماں ملا رموزی سوچو تو کہ وہ جو کلب اور ٹھنڈی سڑکوں پر اٹھلا اٹھلا کر چلنے والیاں تمہارے مضامین پڑھ کر مست ہو جاتی ہیں وہ اپنی حسن و رنگ اور شباب میں ڈوبی ہوئی سہیلیوں کو کہتی ہیں کہ بہن آپ

ہمارے مُلا رموزی صاحب کے مضامین ضرور پڑھا کیجیے اگر وہ سن لیں گی کہ مُلا رموزی صاحب اتنے بزدل ہیں تو سوچ کیا کہیں گی۔

بس اس شخص کا یہ کہنا کہ ہم نے دل سے تیاری کر لی کہ اب چاہے جان جاتی رہے لیکن بغیر آپریشن کے اب نہ رہیں گے لہذا اسنا ؤ میں جو آئے تو بیوی سے کہدیا کہ کل آپریشن ہو گا۔ اماں یہ کہنا تھا کہ ہمارے سید ہے سادہ اور غیر انگریزی داں گھر میں گویا باؤلا کتا گھس آیا یعنی پہلے تو بیوی ہی عدالت کی جج کی طرح ہم سے چمٹ گئیں، مثلاً پہلا ہی سوال وہ کیا کہ دل جانتا ہے یعنی فرمایا اور بہت بے پروا سے لہجے میں فرمایا کہ

یہ آپریشن کیا بلا ہوتی ہے۔

اب بتایئے جس شوہر کی بیوی آپریشن سے اتنی واقف ہو اوس کا شوہر آپریشن کے معاملہ میں کتنا بہادر ہو گا اب جو تفصیل بتایئے تو مسماۃ موصوف کے حواس خراب نظر آنے لگے۔ اماں وہ خدا کی غیر آپریشن داں بندی اوٹھی اور سیدھی پہونچی والدہ صاحبہ کے پاس اور ماجرا کہدیا اب کیا تھا گھر بھر تھا کہ آشفتہ علی بہر سٹر بنا ہوا تھا۔

تو بھی اس کی تمہیں کیا ضرورت ہے ؟

کیا دنیا سے حکیم طبیب بالکل ہی اوٹھ گئے ہیں جو یہ حرکت کرتے ہو ؟ اور آخر تم نے ہم سے تو تذکرہ کیا ہوتا، ہم لاکر دیتے ایسی دوا کہ ایک مہاسہ کیا دس مہاسے اچھے ہو جاتے، وہ پوچھو جاکر رستم علی سے میں نے اوس کے مہاسوں کے لئے کیسی لاجواب دوا لاکر دی تھی کہ پھر نشان تک نہ رہا۔

وہ بولیں کہ ایسی ضرورت ہی کیا پڑی ہے حسین بن جانے کی خدا نخواستہ کچھ اور ہو گیا تو ؟ لیجیے

خالو میاں۔ بولے اس زمانے کے لونڈے بزرگوں کے صلاح مشورے کو تو کچھ سمجھتے ہی نہیں، ورنہ ہم سے کہتے تو بتا دیتے کہ یہ جو تمہارے گھر میں نیب کا درخت کھڑا ہے یہ تو سو دواؤں کی ایک دوا ہے بس اسکی پتے پیس کر آج لگاؤ اور کل نفع دیکھو، مگر بھئی کہیں اوس سے جو ہماری مانے !

اماں احمق ہوئے ہو اِن بے ایمان ڈاکٹروں کا کیا بھروسہ اول تو ان کی دواؤں میں شراب ملی ہوتی ہے جو ویسے ہی مسلمان کے لئے حرام ہے، پھر یہ لوگ بے ہوشی کی دوا سنگھا کر آدمی کو مار ڈالیں

تو ان سے کوئی نہ پوچھے،

اچھا تو وہ امو خلیفہ کا بیٹا کیا بُرا ہے؟

علاج ہی کرانا ہے تو وہ ہمارے گھر کا پُرانا جراح ہے ہزاروں مریض اچھے کر چکا ہے مگر تمہیں تو ہوا لگ چکی ہے نیچری لوگوں کی تم تو اونہی قاعدوں پر چلتے ہو، سنتے تو ہو نہیں بزرگوں کی۔

اچھا تو پھر ذرا ٹھہر جاؤ آج شام ہی کو ہم لاتے ہیں دوا حکیم سلطان محمود صاحب کی، پھر ذرا اس کا اثر بھی دیکھو، بھئی خدا نے اس حکیم کے ہاتھ میں عجب شفا رکھی ہے مگر تم کسی کو مانو جب ؟

وہ بولیں کہ خالو میاں اگر یہ آٹے کا پانی روز صبح لگایا کریں تو دس مہاسے اچھا ہو جائیں،

اب خالو میاں کا تاؤ دوائے اثر سے بھی زیادہ تیز ہو گیا چمک کر بولے مگر دلھن کہیں کس سے، خدا نے تمہارے آدمی کو عقل دی ہو تب ؟

اچھا بھئی ہم جو کہتے ہیں سو وہ کر کے دیکھو، ایک پیسہ کا لاؤ لوبان ایک دھیلے کی لوچھکری، تھوڑا ملاؤ تو سادرا اور ان تینوں کے پانی سے ایک دو دن منہ دھو ڈالو پھر تم سے پوچھ لیں گے کہ وہ مہاسہ کدھر گیا جس کے

علاج کو تم ڈاکٹروں کے پاس جا رہے تھے؟ مگر تم ہماری بات سنو تب!
ایک بولیں۔ اچھا ہے ذرا مزا تو چکھ آنے دو میاں کو ڈاکٹری علاج
کا تو۔

وہ گھبرا کر بولیں۔ نہیں نہیں خالہ بی وہ ڈاکٹر کے پاس یہ مُہاسہ کٹانے جا رہے ہیں مزا کیا خاک چکھ آنے دو۔ خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو آنکھ کے قریب کا معاملہ ہے۔ آپ تو نہ سوچتی ہیں نہ سمجھتی ہیں۔

خالو میاں بولے۔ اچھا بھئی تو اگر شگاف ہی دینا ہے تو لاؤ ہمارے سامنے بیٹھ جاؤ ہم شگاف دیدیں ایسا کہ معلوم بھی نہ ہو تم کو۔ مگر تم ہماری بات مانو جب!

غرض اب جو ہم نے دیکھا کہ گھر میں تذکرہ کر کے گویا اپنے اوپر خود ایک سنگین سا مقدمہ چلا نا ہے اور جرح میں الجھنا اس لئے سوچ کر ہم نے کہہ دیا کہ اچھا اچھا بس سن لیا اب نہ جائیں گے ہم شفاخانے وہ تو انشاء اللہ خود بخود اچھا ہو جائیگا ' ہمارے آخری فقرہ پر تقریباً تمام گھر نے بہ یک زبان زور سے انشاء اللہ کہا۔ مگر ہم نے دل میں طے کر لیا تھا کہ بس ایک دن خموشی سے ڈاکٹر صاحب کے پاس جا کر آپریشن کرا لیں گے

اب یہ نہ پوچھیے کہ اس ارادہ میں کتنے دن تک ہم ہچکچاتے رہے۔
بارے خدا خدا کر کے ایک دن شفاخانے پہونچ ہی گئے۔

جناب گرامی ڈاکٹر اصفہانی صاحب!

ایک حاذق ڈاکٹر ہیں ممدوح کی سب سے نمایاں خصوصیت
یہ ہے کہ آپ زبان اردو میں قابل تعریف و حیرت قابلیت رکھتے ہیں
اور بیدار قوم کے بیدار فرد ہونے کے باعث ممدوح ایک ادیب اور
اخبار نویس کے مرتبے کو بھی پہچانتے ہیں اور اہل قلم کی وہ عزت فرماتے
ہیں جسے دیکھ کر ان دو سے بے بہرہ مسلمانوں پر سو مرتبہ لعنت بھیجنے کو
جی چاہتا ہے پھر سب سے بلند اور لائق صد احترام کمال یہ کہ ایک
بلند مرتبہ ڈاکٹر ہونے پر اخلاق شرافت تواضع اور خوش مزاجی وہ کہ
آپ سے غریب اور بے ذریعہ مریض کافی سے زیادہ محبت کرتے ہیں
اور اب زمانہ بھی غریبوں کے عروج کا آرہا ہے اور یہ کوٹھیوں والے تو
اب جلیسے رہیں گے تعلیم یافتہ لوگ خوب جانتے ہیں۔

اسی طرح حضرت ڈاکٹر اصفہانی صاحب ملا رموزی کے مضامین کے
یوں قدر دان ہیں کہ خود صاحب فضل و کمال بزرگ ہیں لہذا موصوف نے

مُلّا رموزی کے اس خشک مصاحبے کے آپریشن کا جو اہتمام کیا حق یہ ہے کہ اوس کا شکریہ ادا کرنا مشکل ہے ہمارے پہونچنے پر ممدوح نے پہلا اہتمام تو یہ کیا کہ ہمیں اوس کمرہ میں نہ لے گئے جہاں چھریاں چاقو، اور نشتر بہ تعداد کثیر رکھے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ اوس خاص کمرے میں لے گئے جہاں رؤسا اور امرا کے آپریشن ہوتے ہیں۔

اب ادہر تو ڈاکٹر صاحب ہمارا دل بڑہا بڑہا کر ہمارے آپریشن کا اہتمام فرمارہے تھے اور ادہر ہمارے جسم پر مارے وحشت کے خدا جانے کتنے مرتبہ پسینہ آتا تھا تھا اور خشک ہو جاتا تھا۔ کئی مرتبہ ہمت کی کہ ڈاکٹر صاحب سے کہدیں کہ ڈاکٹر صاحب آج تکلیف نہ کیجیے گا انشا اللہ آیندہ جمعہ کو ہم بہت سویرے حاضر ہو جائیں گے مگر مشکل یہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے تمام انتظامات مکمل کر لیے تھے لہذا بہت کم مقدار میں ہمیں غیرت کا اثر محسوس ہوا تو خموش ہو گئے کہ لیجے وہ آپریشن کے کمرہ میں ہمیں پہونچا کر ڈاکٹر صاحب نے اپنا کوٹ اُتارا ہے تو بے ساختہ رونے کو جی چاہنے لگا محض یہ محسوس کر کے کہ او ناداں مُلّا رموزی تو نے یہ کیا حماقت کی کہ گھر میں

کسی سے تذکرہ بھی نہیں کیا اب اگر تو اس آپریشن میں کچھ سے کچھ ہو کر رہ گیا تو خیر عاقبت تو یوں خراب ہو گی کہ خدا جانے ڈاکٹری علاج میں مریض کو آخر وقت میں کلمہ بھی پڑھنے دیتے ہیں یا نہیں؟

اور دنیا یوں خراب ہو گی کہ مریں گے بھی تو لاہور اور دہلی آیسے علمی اور ادبی شہروں سے دور، مگر ڈاکٹر صاحب نے فوراً ہی اشارہ کیا کہ اس میز پر لیٹ جائیے، اب تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا حال ہوا؟ بس اتنا یاد ہے کہ لیٹ گئے، مگر ڈاکٹر اصفہانی صاحب کا کمالِ شفقت ملاحظہ ہو کہ آپ نے اسسٹنٹ سرجن ڈاکٹر رفعت صاحب کو بھی طلب فرما کر ہمارے سرہانے کھڑا کر دیا جو کمال مہربانی سے ہمیں تشفی دینے لگے اور ہم اس تشفی سے یہ سمجھے کہ ہمارا معاملہ ضرور نازک ہے اسی لئے ہمیں یہ تشفی دی جا رہی ہے، سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ ہمیں تو میز پر لٹا دیا گیا تھا اور ڈاکٹر صاحب ہماری نظروں سے دور ہو کر آپریشن کا سامان درست فرما رہے تھے جس کی ہر آواز کو ہم سمجھتے تھے کہ بس یہ ہوا آپریشن مگر بڑی تیزی سے ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب ہمارے پاس آئے تو بے ساختہ ہماری آنکھیں بند ہو گئیں اس پر ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر فرمایا۔

"ملا رموزی آنکھیں تو کھلی رکھو"

ڈاکٹر صاحب کی اس آواز سے ہمیں اتنا اطمینان ہوا کہ اس آپریشن میں آنکھیں بند کرنے کی نوبت نہ آئے گی مگر اب جتنا وقت گزر رہا تھا ہمیں رہ رہ کر رشتہ والے اور عزیز یاد آرہے تھے کبھی محترمہ والدہ صاحبہ یاد آتی تھیں تو کبھی قبلہ والد صاحب کبھی بہن تو کبھی کبھی اکلوتا بیٹا کہ اچانک ڈاکٹر صاحب نے ہم سے فرمایا

"ملا رموزی اگر جاڑا معلوم ہوتا ہو تو کمبل اوڑھ لو"

قسم کھاتے ہیں اس فقرہ پر خدا جانے کتنا خون خشک ہو گیا اور جواب دینے سے پہلے سوچنے لگے کہ اچھا اگر ہمیں جاڑا محسوس ہو رہا ہے تو ڈاکٹر صاحب نے اسے کس طرح پہچان لیا؟ پھر اس وقت ہمیں کمبل اڑھانے کی کیا ضرورت؟ یعنی وہ جو آپریشن کے لئے ہم نے اپنے دماغ میں ہمت کی تھی اس فقرہ سے نصف سے زیادہ کم ہو گئی اور آخری مصیبت یہ کہ اب اس میز پر سے بھاگ جانے کا کوئی راستہ اور بہانہ ہی باقی نہیں رہا تھا کیوں کہ اب تو آپریشن کے آلات کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں جو جنگل میں شیروں کی آواز سے مشابہ معلوم ہوتی تھیں کہ لیجے وہ ڈاکٹر صاحب

ہمارے سرہانے آ گئے اور ڈاکٹر رفعت صاحب نے ہنس کر فرمایا۔

مُلاّ صاحب ذرا منہ کو سیدھا رکھیے۔

ڈاکٹر رفعت صاحب کے اس فقرہ سے ایسا معلوم ہوا گویا کوئی مولوی صاحب کہہ رہے ہیں کہ مُلاّ صاحب اب آپ کا انتقال ہو رہا ہے اس لئے کعبے شریف کی طرف منہ کر لیجیے کہ ہیچے ڈاکٹر اصفہانی صاحب نے ہنس کر ایک سوئی ہمارے مہاسے میں پیوست کر دی تو ہم سمجھے کہ یہ بے ہوشی کی دوا ہے، کیونکہ آپریشن گھر میں داخل ہوتے ہی ہمیں پہلا انتظار یہی تھا کہ کس طرح ہمیں بے ہوش کیا جائیگا۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے فوراً ہی اس سوئی کو باہر نکال لیا، اب تو نہ رہا گیا اور ہم نے دریافت کیا کہ ڈاکٹر صاحب یہ کیا قاعدہ کی رو سے انگریز ڈاکٹر تو اس وقت ہمارے منہ پر طمانچہ مار دیتا اور یہ لوگ اکثر ایسا کرتے ہیں مگر ہمارے ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر فرمایا کہ۔

یہ کُنین کا انجکشن تھا اس سے اب مہاسے کو کاٹنے کی تکلیف محسوس نہ ہوگی۔ واللہ یہ بات بالکل سچ تھی مگر ہم نے اپنی وحشت کے باعث اسے بھی ڈاکٹری دھوکہ سمجھا کہ پیچھے وہ ڈاکٹر صاحب نے قینچی سنبھالی

اور مہاسے کے پرخچے اُڑانا شروع کر دیا۔ مگر ہم اب بھی سوچ ہی رہے تھے
کہ اصل آپریشن تو وہ ہوگا جس میں ہمیں بے حد تکلیف ہوگی اسی لئے ہمیں
چیخنے چلانے سے روکنے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے ایک اور ڈاکٹر کو
اپنے پاس کھڑا کر لیا ہے مگر خدا ڈاکٹر اصفہانی کو سارے ہندوستان کا
ڈاکٹر بنا دے کہ ممدوح نے باتیں کرتے کرتے ہی آپریشن پورا کر کے کہا۔
لیجے مُلّا صاحب تشریف لے جائیے آپریشن ہوگیا۔

ڈاکٹر صاحب نے تو اپنے فن کی حیران بنا دینے والی قابلیت سے
ہمیں فارغ کر دیا مگر ہماری واقفیت کا جو اثر دماغ پر تھا اوس نے
چند لمحات تو یقین ہی نہیں ہونے دیا کہ آپریشن واقعی ختم ہوگیا جب
ڈاکٹر رفعت صاحب نے شانہ ہلا کر کہا کہ اوٹھیے تو ایسا محسوس ہونے لگا
گویا جرمنی کے فرانس شکن توپ خانے کی تیز گولہ باری کے درمیان سے
ہم صاف بچ کر نکل آئے، لیکن مجھے آخر کار دیسی اور مغرب کی ہر
چیز سے نفرت کرنے والے یا ناواقف لہذا اثر وہی رہا یعنی جی تو چاہتا تھا
کہ اگر مسلمان قوم اردو کے مضمون نگاروں کی قدر دان ہوتی تو اس وقت
اتنے بڑے باکمال ڈاکٹر پر جواہر نثار کر دیتی جس نے اس قوم کو زندگی بخش

ذخیرۂ تحریر بہم پہونچانے والے ادیب کا اتنا کامیاب آپریشن کیا کہ اوسے خبر تک نہ ہوئی مگر ڈاکٹر صاحب کو سلام کرکے اپنی انگریزی نواز قوم کو کافی سے زیادہ گالیاں دیتے ہوئے میز سے علیحدہ ہوئے تو اس طرح کہ اب جو زمین پر قدم دہرتے تھے تو اس نزاکت سے گویا اگر ذرا بھی زور سے چلے تو آپریشن ٹوٹ جائیگا یا ہل جائیگا یا خراب ہو جائیگا غرض خدا خدا کرکے تانگے تک آئے اور تانگے والے کو سوار ہونے سے پہلے تاکید کی کہ دیکھو بھئی تانگہ بے حد آہستہ چلانا یہ دیکھو یہ آپریشن ہوا ہے تانگے والا بھی خدا کے فضل سے جاہل ہندوستانی ہی تھا اس لئے اوس نے بھی ہم سے زیادہ نازک مزاج ہو کر جو تانگہ چلایا تو پورے ایک گھنٹے میں گھر میں کیا پہونچے کہ پھر مصیبت میں پھنس گئے اور پھر وہی عدالتی جرح ۔

اُفوہ خدا خیر کرے ۔

یہ کیا ہوا؟

ارے کیا وہی آپریشن تو نہیں ہوا؟

انا للہ!

لاحول ولاقوۃ!
کہہ رہے تھے کہ دیکھو بھئی ذرا ڈاکٹری علاج سے دور رہو۔
اچھا اچھا جلد بستر پر لیٹ جاؤ۔
ارے اِن بچوں کو تو خدا کے لئے باہر بھگا دو اِن کے شور سے اور میرا
دل اُچھلتا ہے یا اللہ تو شفا دینا خیر سے
اچھا تو یہ بتاؤ کہ اب یہ کب اچھا ہوگا "
تو یہ اس پر کونسی دوا لگائی ہے۔
تو اسے کب بدلنا ہوگا؟
پہلے ہی کہا تھا کہ ہم لوگوں کو ان کمبخت ڈاکٹروں کا علاج معالجہ سمجھ ہی
میں نہیں آتا۔ اب بتائیے کہ کیا کریں گے؟
اچھا تو اب پرہیز کیا بتایا ہے؟
تو کیا اب ڈاکٹر صاحب تمہیں روزانہ دیکھنے آئیں گے یا تم خود ڈاکٹر صاحب
کے پاس جایا کروگے؟
خالو میاں بولے۔ کیا تا آخر کو لونڈا پن؟
ہاں بھئی ہماری کون سنتا ہے زمانہ ہی ناخلف آگیا ہے، پہونچ ہی گئے

آخر کو ڈاکٹر کے پاس،

لیجیے اوس بے رحم نے کاٹ کر رکھدیا، یہ بھی تو نہ دیکھا کہ آنکھ کے قریب کا معاملہ ہے۔

خیر بھئی اب تو جو ہوا سو ہوا۔ اب یہ بتاؤ کہ اوس نے اس پر لگایا کیا بس وہی پھٹکری کی پٹی لگائی ہوگی ان کمبختوں کے ہاں اور دھرا ہی کیا ہے۔

اچھا بھئی یہ تو کہو کہ تمہیں کتنی دیر بے ہوش رکھا؟

بڑی تکلیف ہوئی ہوگی تمہیں تو؟

وہ یوں کہا میں نے کہ یہ لوگ بڑے جلاد ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے تو خاصے دشمن۔

اماں ہم سے کہتے تو ہم ساتھ چلتے اور اس طرح اپنے سامنے چیرا دلاتے کہ تمہیں تکلیف نہ ہونے دیتے۔

اچھا تو پھر پرہیز کیا بتایا ہے۔

ہم تو چاہیں کہ اب تم اس پٹی کو پھینک کر نیب کے پتوں کی پٹی باندھ لو اور انشاءاللہ شام تک ہی اوس کا اثر دیکھ لو

وہ بولیں۔ خالہ میاں تو ہر جگہ نیب کی پٹی ہی لئے پھرتے ہیں جہاں

موقع ہو یا نہو۔ اس پر۔

خالو میاں۔ بولے، ہاں ہاں دلہن سچ کہتی ہو۔ ہاں بھئی زمانہ بزرگوں پر اعتراض کا آگیا ہے۔ عجب "ناخلف زمانہ" ہے خیر بھئی جو تمہیں نظر آئے وہ کرو ہم اب نہ بولیں گے مگر اتنا کہے دیتے ہیں کہ ہوشیاری سے علاج کرانا معاملہ ہے ڈاکٹری کا آگے بھئی جو تمہیں نظر آئے۔

مگر بھئی یہ تو کہو کہ اب وہ ڈاکٹر کو کیا دینا ہوگا کیوں کہ یہ لوگ تو نہ دیکھیں امیر نہ دیکھیں غریب انہیں تو اپنی فیس سے کام، مگر تم یوں کہنا کہ کوئی فائدہ نظر آئیگا تو فیس دیں گے، اور ہم تو جانیں کہ اب ڈاکٹر کے پاس جاؤ کیوں؟ اور بھئی ہم تو دلہن کے کہے سے اب زیادہ بولنا ہی نہیں چاہتے کیوں کہ ہماری بات کا تو اب مذاق اُڑایا جاتا ہے، مگر ہاں دیکھتے ہیں تو رہا نہیں جاتا۔

القصہ یہ تو ایک ٹھیٹ پرانے خیال کے گھرانے کی بدحواسی کا خلاصہ تھا مگر جب تک ہمارا غسل صحت نہیں ہوا ہے دل ہی جانتا ہے کہ ہمارے روشن خیال دماغ میں کیسے کیسے خطرات پیدا ہوتے تھے۔ بالآخر اس آپریشن سے اچھے ہوکر ہم اس فطری اور قدرتی نتیجے پر پہونچے

کہ مشرق مشرق رہے گا اور مغرب مغرب ہی ہے۔ اور بات ہے کہ چند دن
کے لئے ہندوستانی انگریز بن جائیں اور انگریز ہندوستانی مگر خواص
اور پیدائشی خصوصیات کے حساب سے ہندوستانیوں کے لئے
ہر حال میں حکیم اجمل خاں مغفور کے گل بنفشہ اور تخم خطمی والے نسخے
ہی کچھ زیادہ موزوں اور مفید ہیں۔ باقی سب خیریت ہی خیریت ہے ۔

مراق

صاحب غیاث نے مالیخولیائے مراق کی تعریف یہ کی ہے کہ معدہ سے جو غلیظ ابخرہ پیدا ہوتے ہیں اون سے دماغ میں ایک قسم کا اختلال پیدا ہوتا ہے، مگر ہمیں ان تمام امراض پر طبی دیا سلائی سے روشنی ڈالنا مقصود ہی نہیں بلکہ ہمیں تو از روئے ظرافت و زندہ دلی ان کے ہنسا کر غم سے دور کر دینے والے حصوں سے بحث ہے اس لیئے ہمارے ہاں اس سے کوئی بحث نہیں کہ یہ مرض کیوں پیدا ہوتا ہے؟ البتہ علمی نقطۂ نظر سے اسکی تاریخ پیدائش یا اس مرض کے وطن کی تحقیق لازم ہے سو آنکھ بند کر کے مان لیجئے کہ جسطرح آتشک ایسا موذی مرض ہندوستان میں یوروپ کے سپاہیوں کی لائی ہوئی لعنت ہے اوسی طرح مرض مراق بھی ہندوستان میں یوروپ والے ہی لائے ہیں، جسکا تاریخ سے بھی اونچا ثبوت یہ ہے کہ اس مرض کے نہایت ہی قیمتی نسخے ارسطو اور افلاطون

کے قلم کے لکھے ہوئے موجود ہیں اور یہ جلیل القدر حکما ملک
یونان کے باشندے تھے جو ایک وقت بھی ہندوستان نہیں
آئے تھے اور ظاہر ہے کہ ملک یونان یورپ ہی کا ایک حصہ ہے
لہذا یہ مرض سب سے پہلے یورپ اور یونان ہی میں پیدا ہوا
جسے دیکھ کر یونان کے حکیموں نے نسخے تجویز کیئے گویا اسطرح یہ بھی
ثابت ہوگیا کہ جو یوروپ والے جہاں ایشیائی ممالک میں تہذیب
و شائستگی پھیلانے آتے ہیں وہاں مراق اور مالیخولیا بھی پھیلا
جاتے ہیں اور یہ مراق نہیں تو کیا علم و عقل ہے کہ ہندوستانی
انگریزی زبان سیکھتے ہی اپنے ملک اور اپنے آبائی مذہب تک
میں ترمیم کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے ورنہ عقلاً تو زبان انگریزی
صرف اس لیئے ضروری ہے کہ اوسے حاصل کرکے آدمی نوکری کرے
اور زیادہ سے زیادہ کاروبار میں تبادلہ خیال کرے، مگر یہ کس
علم میں آیا ہے کہ انسان اپنی زبان اپنا لباس اور اپنی رسوم
کو ترک کرکے دوسری قومیت میں یوں جذب و
شامل ہو جائے کہ نہ وہ اس قوم کا رہے نہ اوس قوم کا مگر

دیکھ لیجئے کہ بقول اخبار ات آج اور تو اور ایک چھوٹے سے مرزا . . . . . نے صرف ایل ایل بی تک پڑھ کر ہی یہ لکھدیا کہ مسلمان عورتوں تک کو ناچ گانا سکھانا مذہباً جائز ہے مگر اون چیزوں کا نام تک لینے سے مرزا صاحب کی روح کانپ گئی جن کے ذریعہ یاروں نے اون کے باپ دادا کا ملک فتح کر کے رکھدیا غرض اس مرض کے اثر سے ایسی ہی سوجھتی ہے -

خلاصہ یہ کہ اس مرض کا مریض اپنی حرکات کے لحاظ سے کچھ اس درجہ حسین ہو جاتا ہے کہ دیکھئے اور وجد کرتے رہیئے مثلاً آپ کو جہاں مراق شروع ہوا کہ آپ نے بجائے آبائی پاجامہ کے یورپ کے لوگوں کا وہ پاجامہ پہن لیا جسے شکم اقدس پر بجائے کمربند کے موٹے چمڑے سے یوں کسا جاتا ہے کہ برسوں استعمال کے بعد بھی آپ مارے تکلیف کے اوس چمڑے کو منٹ منٹ پر ایک جگہہ سے دوسری جگہہ حرکت دیتے رہتے ہیں مگر شکم مبارک میں کھانا کھانے ہی جو ہوائیں پیدا ہوتی ہیں اون کے زور سے یہ پتلون اور اسکا چمڑا آپ کو کرسی پر آرام سے ہنہیں بیٹھنے دیتا اور آپ مہذبانہ

لوگوں سے مخاطبت کے وقت بھی شکم پر سے بار بار پتلون کی بیلٹی ادہر سے اُدھر ہٹاتے ہوئے آپ جیسی بندری اور لنگوری صورت سے بن جاتے ہیں اسکا اصل نام فراق ہے۔ کیونکہ مراق اصل میں معدہ کے خراب بخارات کے بگڑنے سے پیدا ہوتا ہے اور آپ پتلون سے اسی وقت گھبراتے ہیں جب آپ کے معدہ کے بخارات کو پتلون کی بیلٹی روکتی ہے اور جب یہ پتلون آپ کو تکلیف دیتی ہے تو اسے درست کرنے سے آپ پر بندر اور لنگور کی سی حرکات نمایاں ہونے لگتی ہیں، دوسرا مراق یہ ہے کہ آپ پتلون کو بغیر تحقیقِ ضرورت استعمال کرتے ہیں یعنی یہ بے میانی کا پاجامہ یوروپ والے تو اس لیئے استعمال کرتے ہیں کہ ادن کے ہاں زمین بارہ مہینہ کی بارش اور برف باری کے اثرات سے کبھی اس قابل نہیں ہوتی کہ وہاں آدمی زمین پر بیٹھ سکے اس لیئے وہاں کے لوگوں نے وہاں کی اس حالت سے تنگ آکر اس پاجامہ کو ایجاد کیا اور نشست کے لیئے کرسی ایجاد کی تاکہ وہاں کی مرطوب زمین کے اثرات سے محفوظ رہیں، اگر آپ بتائے کہ آپ کے ملک میں زمین کے اندر ایسی

کونسی بارش اور دریا بھرے ہیں جنکی سردی سے محفوظ رہنے کے لیئے آپنے
یورپ والوں کی پتلون استعمال فرمائی، لہذا ثابت ہوا کہ مراقی وہ جو
ہندوستانی ہوکر یورپ والوں کی پتلون پہنے
اس کے بعد کے عام مراقی یہ ہیں،
۱۔ مثلاً مراقی نمبر ۱ وہ جو گھر سے بازار جانے کے ارادہ سے نکلا ہو مگر راستہ
میں سے بغیر بازار جائے آپ کے ساتھ ہو جائے اسطرح کہ آپ جہاں جاکر
اوس سے کہیں کہ اچھا اب میں معافی چاہتا ہوں اب مجھے یہاں سے
دفتر جانا ہے آپ تشریف لیجائیے تو وہ آپ سے کہے کوئی پرواہ نہیں چلئے
میں دفتر تک آپ کے ساتھ چلتا ہوں وہاں سے واپس آجاؤں گا تو آپ
گھبرا کر کہیں کہ نہیں نہیں، میں بھول گیا آج دفتر کی تو تعطیل ہے۔ مجھے اپنے
سسر کے ہاں جانا ہے تو وہ کہے کہ کوئی حرج نہیں میں وہاں تک
آپ کے ساتھ چلتا ہوں اب آپ سسر کے گھر پہونچ کر گھر میں گھس جائیے
اور پورے تین گھنٹہ تک ان کی خبر بھی نہ لیجئے مگر یہ دروازہ کے باہر اسطرح
ٹہلتے رہیں گے کہ جو شخص اون کے سامنے سے گذریگا یہ اوسے بڑے
تپاک سے خود سلام کر کے روک لیں گے اور مارے باتوں کے اسے

عاجز کردیں گے اب جو آپ باہر آکر کہیں گے کہ اقو بھائی صاحب آپ کو
بہت زحمت ہوئی تو یہ فوراً ہنس کر کہیں گے کہ جی کوئی حرج نہیں میں بھی
فلاں صاحب سے باتیں کر رہا تھا اب آپ کو دل میں اطمینان ہوگا کہ یہ
شخص اب تو میرا پیچھا چھوڑ دیگا ۔ لہذا آپ کہیں گے کہ اچھا بھائی صاحب
اب میں معافی چاہتا ہوں کیونکہ وہ میرے گھر کے لوگوں نے کہا ہے کہ میں
ذرا ملا رموزی صاحب کی کتابیں بازار سے جاکر خرید لاؤں تو یہ فوراً کہیں گے
کہ سبحان اللہ بہت ہی خوب چلیے چلیے میں بھی آپ کے ساتھ بازار تک
چلتا ہوں کیوں کہ وہ مجھے بھی تو آپ کی بھاوج نے بازار ہی بھیجا تھا مگر
افسوس کہ میں آپ سے باتوں میں ایسا کھو یا کہ بس آپ کے ساتھ ادھر نکل آیا
اب آپ یہ ہی سنکر خوش ہوں گے کہ چلیے بازار سے تو پیچھا چھوٹ جائیگا ۔
لیکن جہاں آپ بازار میں پہونچے اور آپ نے کسی دکاندار سے گفتگو شروع
کی کہ بغل سے جھک کر اون بزرگ نے اوس دوکاندار سے جرح شروع کی کہ دوکاندار
بھی تنگ اور آپ بھی تنگ پھر بار بار ہیں کہ کہہ رہے ہیں کہ حضرت آپ فلاں
دکان پر آپ میرے ہمراہ چلیے دیکھیے میں یہی چیز آپ کو کتنی ارزان اور کم قیمت
پہ دلاتا ہوں غرض اسطرح دوکان دوکان آپ کو ذلیل کرکے پھر گھر تک کے لیے

آپ کے ساتھ ہو جائیں گے اب آپ دل میں یہ کہکر کہ ائے خدا تو اس پاگل
کو زمین کا پیوند بنا دے اون سے کہیں گے کہ مسٹر وہ آپ کو بھی تو بازار
سے کچھ خریدنا تھا۔ لہذا آپ تشریف لیجائیے خدا جانے بھاوج صاحبہ کب سے
اوس چیز کے انتظار میں بیٹھی ہوں گی تو یہ فوراً کہیں گے کہ نہیں نہیں،
کوئی حرج نہیں وہ چیز اس بازار میں نہیں ملتی مجھے اوس کے لیئے چوک
بازار ہی جانا پڑے گا لہذا میں آپ کو گھر تک پہونچا کر پھر چلا جاؤں گا اوس
طرف سے مجھے چوک بھی قریب پڑیگا اور یہ کہنے کے بعد ہی بیوی کے منتظر
رہنے کی تردید بھی شروع کر دیں گے جسکی تفصیل آپ کے گھر تک بھی
پوری نہ ہوگی مثلاً یہ کہ کیا کہوں حضرت خدا نے مجھے جیسی نیک اور فرمان بردار
بیوی دی ہے خدا میرے ہر بھائی مسلمان کو ویسی بیوی دے حق یہ
ہے کہ میں اس غریب کی ایک فرمائش بھی پوری نہیں کرتا مگر وہ ہے کہ پھر
بھی میری خدمت و فرماں برداری کے لیئے چوبیس گھنٹہ کمربستہ کھڑی
رہتی ہے اب ظاہر ہے کہ اتنے طویل عرصہ تک ان کے ہمراہ رہنے سے
آپ کی شرافت اور آپ کی خوش خُلقی زور پر آئیگی۔ لہذا گھر پر اگر آپ نے
جھوٹ کو کہدیا کہ مسٹر اب کہانا تیار ہے کھا ہی لیجئے کہ یہ فوراً کہیں گے کہ

بھئی اس تکلف کی کیا ضرورت ہی کیا ہیں اپنے اور آپ کے گھر میں کوئی فرق سمجھتا ہوں لائے بسم اللہ اس موقع پر خاکم بدہن لفظ بسم اللہ پہ جو تا ؤ آتا ہے دل جانتا ہے خدا معاف کرے،

اب جو دستر خوان پر یہ بیٹھ گئے تو آپ جب چاہیں جتنا چاہیں کھالیں مگر ان کے ہر لقمے سے ایک طویل داستان لپٹی رہیگی جس کے سلجھانے سے ان کی زبان اتنی فارغ ہی نہو گی کہ یہ لقمہ کو حلق کے اندر پہونچا سکیں جہاں ایک لقمہ اوٹھایا کہ فوراً اس ترکاری پر تنقید، تبصرہ، نقد و نظر، بحث و تمحیص، انتقاد، ریویو، نظر سے خوش گذرے، نکتہ چینی اور جرح شروع فرمادی ایسی کہ اُن کی زیر بحث ترکاری بجائے ان کے آپ کھا گئے مگر انھیں بحث ہی سے فرصت کہاں جو یہ ملاحظہ فرمائیں کہ ترکاری کون کھا رہا ہے،

پھر ان کی بحث کا تمام زور اپنی بیوی کے "باورچی پن" پر خرچ ہوگا اسطرح کہ کیا عرض کروں بھائی صاحب کبھی آپ اون کے ہاتھ کا پکا ہوا پلاؤ کھائیے تو کہیں اور بھائی مرغ کے کباب بنانے میں تو اون کو قیامت کا ملکہ حاصل ہے میں تو عرض ہی نہیں کرسکتا بس کسی وقت کھائیے تب ہی آپ کو اندازہ ہوسکتا ہے،

وہ ایک مرتبہ میرے بڑے بھائی صاحب نے جو ایم اے، پاس بھی ہیں اور آجکل بریلی کے محکمہ قضا کے افسر اعلیٰ ہیں ایک ڈپٹی کلکٹر کی دعوۃ کی جو انھیں دنوں ولایت سے آیا تھا بس کیا عرض کروں بھائی صاحب کہ جو میں نے آپ کی خادمہ کا پکایا ہوا پلاؤ اسے کھلایا ہے تو واللہ ولایت تک سے تین برس تک اوس کے خطوط آتے رہے جن میں وہ آپ کی بھاوج کے پلاؤ کی تعریف کرتا رہتا تھا، غرض انکا سلسلۂ کلام برابر جاری رہیگا یہاں تک کہ آپ اس شرافت میں مقلد سے زیادہ کھانا خود ہی کھالیں گے کہ ایسا نہ ہو کہ میرے فارغ ہوجانے سے یہ غریب مارے حجاب کے بھوکا رہ جائے مگر انھیں انہ اس کا ہوش وہ تو کھا بھی رہے ہیں بحث بھی فرما رہے ہیں اور لقمہ ہاتھ میں لیکر لمحوں بیٹھے بھی ہوئے ہیں اب جو خدا خدا کر کے کھانا ختم بھی ہوا اور کہیں آپ نے لکھنؤ کا حقہ پیش کر دیا تب تو سمجھ لیجئے کہ اب یہ آپ کی جان ہی لیکر واپس ہوں گے یعنی جتنا وقت انھوں نے کھانے پر برباد کیا اوس سے سوا اب حقہ پر صرف ہوگا اور اب کھانے کی جگہ "حقہ جاتی مسائل"، پر اظہار خیال ہوگا (یہاں حقہ جاتی بوزن صوبہ جاتی صحیح ہے)

القصہ اب یہاں اتنا وقت برباد کرنے کے بعد ان میں کے اکثر

تو چاروناچار رخصت ہوجاتے ہیں اور جن کا مراق کافی شباب پر ہوتا ہے وہ کھانے
کے بعد یا تو خود ہی خود "قیلولا" بن جاتے ہیں یا بے تکلفی سے آپ ہی سے
دو گز زمین اور ایک چادر مانگ کر آپ کے باہر والے کمرے میں سو بھی جاتے
ہیں غرض مانی ہوئی بات ہے کہ مراق کا مارا ہوا اپنے گھر سے صبح سے
جاکر شام ہی کو واپس گھر آتا ہے اور غریب بیوی ہم سے تم سے مدد لے
کر زندہ رہتی ہے،

ان کا یہ ہی عالم گھر میں رہتا ہے یعنی بلا سے بیوی ابجد خواں بھی نہ ہو
مگر یہ اسکا کوئی فیشن ایبل نام رکھ کر جیسا کہ آجکل کے انگریزی داں ہندوستانی
اپنی بیوی کے مسماۃ نصیبن بی نام کو بدل کر شوکت جمال رکھ لیتے ہیں تمام دنیا
میں تو اسکا تذکرہ کرتے پھرتے ہیں پھر ادپرسے گھر میں رہ کر بھی اس غریب
بے زبان کا مارے بحث و جرح کے ناطقہ بند کیئے رہتے ہیں وہ غریب اگر
کہیگی کہ آجکل گھی بہت گراں ہے تو فقط ہاں یا ٹھیک ہے کہکر اسکا پیچھا نہ
چھوڑیں گے بلکہ گھی کی لغوی تعریف کریں گے پھر اسکی پیدائش پر بحث
فرمائیں گے یہاں تک کہ آخر میں وسیرائے کی کونسل میں گھی کے مسودۂ قانون
پاس ہونے پر بحث کرتے ہوئے کونسل کے کسی ممبر کے ذاتی حالات بتانے

بتاتے شام کردیں گے اگرچہ اس عرصہ میں بیوی ان کے سامنے سے دس مرتبہ اٹھکر ادہر ادُہر چلی بھی جائیگی مگر یہ جس پہلو سے بیٹھے اظہار خیال شروع کریں گے شام تک اوسی انداز سے ان کی زبان چلتی رہیگی پھر وہ بھی بالکل قینچی کی طرح،

مراق کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ آپ گھر سے بائیسکل ہاتھ میں لیکر باہر نکلے اور تمام شہر میں گھوم کر گھر آگئے سائیکل ہاتھ میں رہی مگر ایک جگہہ بھی اوسپر سوار ہونے کا خیال نہ آیا،

یا کبھی عمر میں موزے پہننے کا خیال آیا تو اس طرح کہ موزے اوپر اور پاجامہ نیچے،

یا سڑک پر تنہا چلے جارہے ہیں مگر اسطرح ہاتھ ہلاتے ہوئے گویا کسی شخص سے زور شور سے باتوں میں مصروف ہیں،

یا گھر سے بغیر کوٹ اور شیروانی پہنے تمام بازار میں گھوم آئے اور گھر کے دروازہ پر واپس پہونچکر کہا کہ ارے لاحول ولا شیروانی تو بھول گیا تھا،

یا دو چار آدمیوں میں چپ بیٹھے تو اسطرح کہ اپنی مسلسل اور بے ربط باتوں سے خود بولتے رہے اور سبکو چپ رکھا،

آخری مگر سب سے نازک مراق کی پہچان یہ ہے کہ ایسا آدمی اگر کسی جگہہ کا افسر یا عہدہ دار بھی ہوجاتا ہے، تو پھر مصیبت ہی آجاتی ہے،

ایک قسم مراق کی یہ ہے کہ اچانک آپ نے یہ سوچا کہ

اُفوہ مرگیا، ہائے اسکی یہ بالی عمر اور یہ قیامت کہ وہ اسکول کی نویں جماعت میں پڑتی ہے اور ابھی سے شعر کہنے کی یہ مشق !!!

اُفوہ آنکھوں میں خمار تھا کہ حیا و حجاب اور شوخی و سرمستی کا رنگا رنگ میخانہ؟

اور تو یہ جو اوس کے سینے سے میں نے اسکا دوپٹہ ڈھلکا ہوا دیکھا اور وہ مجھے دیکھہ کر شرمائی، اور تو یہ جو اس نے مجھے پھر اشارہ کیا اور مسکرا کر چھپ گئی، اور خدا کی پناہ اوس کے چہرے کا رنگ تھا کہ نور کے دریا کی موجوں میں شفق ملادی گئی تھیں اور پھر بیٹی بھی کس کی کہ اتنے بڑے آدمی کی،

بس یہ خیالات پیدا ہوئے ہی تھے کہ آپ فوراً مُلا رموزی کے پاس آئے اور ہانپتے کانپتے ہوئے لہجے میں آپ نے کہا کہ خطا معاف ملا صاحب ہے تو گستاخی مگر جذبات سے مجبور ہوں،

جی ہاں جی ہاں اُنھیں کی لڑکی،

پاپا، ہاں منجھلی ہے یا چھوٹی یہ ابھی معلوم نہ کرسکا مگر ہاں تھی اُنھیں کی کیونکہ

موٹر تو میں نے صاف پہچان لیا تھا،

تو بس ملا صاحب یہ آپ کا آخری احسان ہوگا اگر آپ پہلے ہی خط میں اُسے میری طرف متوجہ کر دیں گے اور میں عمر بھر آپ کا غلام رہوں گا۔

جی ہاں اوس نے خود ہی کھانس کر مجھے متوجہ کیا تھا،

بس میں نے جو موٹر کی طرف دیکھا تو مجھے خوب یاد ہے کہ اوس نے ہنس کر مجھے کچھ اشارہ بھی کیا تھا مگر ہمارے بد قسمتی کہ اوس وقت کمبخت سامنے سے بڑے مولوی صاحب آ رہے تھے اس لیئے میں اچھی طرح دیکھ ہی نہ سکا اور خدا کی قسم ملا صاحب اوس کے ہاتھوں کی مہندی اور کلائی پر کی گھڑی تو میں نے صاف صاف دیکھ لی۔

جی ہاں وہ تو اس کے باپ کی موٹر سے میں نے اسے پہچان لیا ورنہ میں تو مر گیا ہوتا جو یہ پہچان نہ ہوتی،

اچھا تو پھر کل تک آپ یہ خط لکھ رکھیے گا مگر خدا کیلئے ملا صاحب ایسا بھی لکھیے گا کہ وہ میرے لیئے بے چین ہی ہو جائے۔

اسلام علیکم ملا صاحب،

خدا آپ کو بادشاہ کر دے بس کمال کر دیا ملا صاحب سبحان اللہ لیجیے

لیجیے یہ اسکا جواب آگیا، خدا کی قسم ملا صاحب خط لکھنے میں تو آپ کا
ہندوستان بھر میں جواب نہیں، واللہ آج دہلی کی ڈاک سے جواب آیا ہے
اور دیکھیے تو پہلے ہی خط میں لکھتی کیا ہے مجھے؟ دیکھا آپ نے؟

اب جو گھر گئے تو حال یہ کہ باتیں کر رہے ہیں بھائی سے اور دماغ اوسی کوٹھی
اوسی محل اور اسی بنگلے میں پڑا ہوا ہے جہاں وہ رہتی ہے کہ یکایک خیال
آیا کہ وہ اخبار "زمیندار لاہور" میں جو اشتہار چھپتا رہتا ہے کہ "معشوق عاشق
کے قدموں پر" تو کیوں نہیں اس اشتہار والے تعویذ کو منگا کر آزمایا جائے
اور وہ جو خود ملا رموزی صاحب کے پاس تسخیر کا اتنا بڑا عمل ہے تو اسے
انکی خدمت کرکے کیوں نہ حاصل کیا جائے بس ان خیالات کا آنا تھا کہ اب
آپ کے کمرے میں تعویذوں گنڈوں عملیات کی کتابوں زعفران وعنبر اور
لوبان کا کافی ذخیرہ موجود ہے، گوشت ترکاری پھل غرض سب کچھ کھانا
حرام ہوچکا ہے بارہ بجے رات کو کسی منہدم سی مسجد کے صحن میں کسی دریا کے
کنارہ کسی سنسان اور مرگھٹ میں بیٹھے وظیفے پڑھے جا رہے ہیں دوستوں
میں جب تذکرہ ہے، تو اسی کا پھر وہ بھی اول سے آخر تک چاہے کوئی سنے
یا نہ سنے اس حد تک معاملہ پہونچنے پر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یا آپ گھر سے بھاگ

جاتے ہیں یا وہ بھاگ جاتی ہے مگر اس عرصہ میں آپ قدم قدم پر مراقی بگاڑ سے جاتے ہیں

مراق کی ایک لطیف تر قسم یہ ہے کہ آپ کو یقین ہو جائے کہ آپ بقدر سے زیادہ موٹے ہوتے جا رہے ہیں بس اس یقین کے پختہ ہوتے ہی آپ کے اندر بخار یا اور لنگوری کے سے خواص پیدا ہو جائیں گے۔ چنانچہ سب سے پہلے تو آپ کی عقل آپ کو جواب دیدے گی اسطرح کہ آپ طبعی فطری اور اصلی بھوک کے خلاف جہاد شروع کر دیتے ہیں اور بجائے روٹی کے اب پھل کا کھانا شروع کر دیتے ہیں اور وہ بھی نصف یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ پھر آخری بدعقلی یا عقلی مراق کا پہلا ثبوت یوں ملتا ہے کہ آپ اپنے موٹاپے کے کم یا زیادہ ہونیکا خود ہی اندازہ لگا لیتے ہیں یعنی ایک دن اپنے مٹکے اور گھڑے کی قسم کے شکم کو خود ہی دیکھا دو چار مرتبہ ہاتھ پھیرا کوٹ کے بٹن لگا کر دیکھا اور خود ہی یقین فرما لیا کہ ہاں کم کھانے میں آج موٹاپا کم ہو گیا اب جو اس سے کبھی اطمینان نہیں ہوا اور مراق نے اور زور دکھایا تو آپ لگے ہنڈرولی ایسی حرکات سے کام لینے جسے انگریز لوگ اکسرسائز اور وطنی علماء ورزش کہتے ہیں مگر ہندوستانیو

پر چونکہ انگریزوں کا بھوت سوار ہے لہذا خمیر تو بنا ہے ہندوستان کی
مفتوح، غلام اور بے حیثیت مٹی سے مگر نقل ہر حال میں کرتے ہیں یورپ
والوں کی لہذا ورزش بھی کریں گے تو یورپ والوں کی اور چونکہ سرد
ملک والوں کے خون میں قدرتاً جمود ہوتا ہے اس لیئے سے سخت محنت سر
حرکت میں لانے کے لیئے انھوں نے سخت سے سخت محنت والی ورزشیں
ایجاد کی ہیں اور ہندوستان گرم ملک ہونیکے باعث اپنے باشندوں کو
سخت محنت سے روکتا ہے مگر نقالی کا بُرا ہو کہ ہندوستانی جب یورپ
والوں کی سخت محنت والی ورزش کو اختیار کرتے ہیں تو الحمدللہ کہ بجائے
اسّی اور نوّے برس کی عمر پانیکے ہندوستان کے اچھے اچھے انگریزی
ورزشوں والے پچاس ساٹھ برس سے زیادہ زندہ نہیں رہتے اور انگریزوں
کا جو لارڈ بھی مرتا ہے وہ نوے اور پچانوے برس سے پہلے نہیں مرتا دور
کیوں جایئے وہ اپنے مسٹر لائڈ جارج اور مسٹر چرچل ہی کو دیکھ لیجئے کہ جنے
آپ نے جب دنیا میں پہلی مرتبہ آنکھیں کھولی ہیں اسوقت بھی یہ دونوں
زندہ تھے پھر جب ہم آپ تعلیم پانے گئے تب بھی یہ زندہ تھے پھر جب
دنیا کی سب سے بڑی جنگ یورپ ہوئی اسوقت تو گویا یہ دونوں ہی اس

تاہم جنگ وخوں ریزی کو روک رہے تھے پھر جب ہماری آپ کی شادی
ہوئی تب بھی یہ دونوں زندہ تھے اور آج جبکہ ہم آپ بال بچوں والے
ہوکر وفات پانے کیلئے تیار ہو رہے ہیں تب بھی یہ دونوں زندہ
ہیں اور کم از کم ہندوستانیوں کا تو دل ہی خوب جانتا ہے کہ یہ دونوں
کسطرح زندہ ہیں مگر آپ ہندوستان کے کسی بڑے سے بڑے کھلاڑی
کا نام بتا دیجئے جس نے محض یورپی وضع کی ورزش کے اثر سے ایک
کم سو برس کی عمر پائی ہو؟ مگر غلامی سے جب دماغ ہی ادھڑھا پیدا
ہو تو کسی بی اے یا ایم لے پاس ہندوستانی کی کیا خطا،
لہذا اب جو یقین ہوا کہ انگریزی ورزش سے موٹا پا کم ہو جائیگا تو لگے بندروں
اور لنگوروں سے سوا کودنے اچھلنے اور ناچنے پھر بھی نہیں کہ ایک آدھ دن
کودلیئے اور بیٹھ گئے بلکہ دنوں ہیں کہ قلابازیاں کھاتے پھرتے ہیں اور بار
بار پیٹ پر ہاتھ پھیر کر دیکھتے ہیں کہ موٹا پا کم ہوا یا نہیں ؟
اب اگر نہیں یہ مراق یہاں سے ذرا ترچھا ہو گیا تو کسی حکیم کے مطب
کو جا لیا اور اب صبح وشام ہیں کہ حکیم صاحب کے مطب میں بیٹھے ہوئے
ہیں حال یہ کہ کوٹ کی جس جیب میں دیکھئے نسخوں کی کتابیں کی کتابیں

اور دواؤں، پرہیز، اور طریق استعمال کی یادداشتوں کی مثلوں سے ہر جیب بھری پڑی ہے۔ پھر خاص پہچان یہ کہ حکیم صاحب جلدی بتا کر اور بیار سے چاہیں کہ آپ مطب کے اول وقت میں حال بیان کر کے نسخہ لکھا لیں تو آپ اسے کبھی منظور نہیں کریں گے بلکہ نہایت اطمینان سے حکیم صاحب سے کہدیں گے کہ مجھے کوئی تکلیف نہیں آپ مطب کے تمام مریضوں سے فارغ ہولیں تو میں عرض کرونگا اب تین چار گھنٹہ تک حکیم صاحب اور دوسرے مریض ہیں کہ مصروف ہیں اور آپ ہیں کہ یا تو اپنے ہی خیالی مرض کی ادھیڑ بن میں مصروف ہیں یا پھر ہر مریض کا حال سنکر پریشان ہو رہے ہیں یہاں تک کہ مراق کا دورہ اگر ور پر آ گیا تو کسی مریض کے حال کو سنتے ہی اتنے پریشان ہوئے کہ مارے وحشت کے حکیم صاحب سے بغیر حال کہے کوئی بہانہ کر کے گھر چلے آئے یا بیٹھے بھی تو اسطرح کہ اپنا حال اور اپنا مراق تو بھول گئے اور اس مریض کے مرض میں کھو گئے اب جو حکیم نے آپ سے حال دریافت کیا تو تفصیل سے عرض کرنے کے عیوض مختصر سا کچھ کہکر چلدیئے اور دوسری صبح کو سب سے پہلے پھر مطب میں موجود،

اب جس دن بھی آپکے منشاء کو موافق حکیم صاحب نے آپ سے مخاطبت
کی اس دن آپنے جو اپنے مرض کی تفصیل یعنی اسکی پیدائش اسکی قوت سبقت
اسکی عمر اور اس کے پچھلے علاج اور پچھلے حکیموں اور ڈاکٹروں کے نسخے
کی تفصیلات کو شروع کیا تو حکیم نے صاف سمجھہ لیا کہ اب آپ سے
پیچھا چھوڑانا مشکل لہذا ثابت شد کہ آپ مراق نمبر اول کے مریض
ہیں لہذا اس غریب نے تو ایک نسخہ مراق کا گھسیٹ دیا اور آپ سے
کہدیا کہ کچھہ نہیں آپ کو معمولی نفخ کی شکایت ہے مگر جوں ہی کہ اس نے
آپ کے مرض کو معمولی کہا اور آپ اس کے گلے کا ہار ہو گئے اور پھر آپ
نے اس مرض کی تمام تفصیل اور دوسرے حکیموں کی تشخیص اون کی ادویہ
انکے طریق علاج وغیرہ وغیرہ کی تفصیل سُناکر ان سے منوانے کی
کوشش کی کہ یہ بھی کہدیں کہ ہاں واقعی آپ کا مرض بہت خطرناک
ہے اور اب جانے والا نہیں مگر حکیم پھر حکیم ہوتا ہے لہذا اسنے صبر سے کام
لیکر کہدیا کہ بہت ٹھیک تو آپ چار دن میرے اس نسخہ کو استعمال کر کے
آئیگا تو میں دوسرا نسخہ تجویز کردوں گا اب اسے اطمینان ہوا کہ کم از کم
آپ چار دن کے لئے تو گئے مگر یہ حکیم دوسرے ہی صبح کو کیا دیکھتا ہے

کہ آپ موجود ہیں اور تمام مطب ختم ہونے کے بعد آپ نے پوچھا بھی تو
صرف اتنا کہ وہ جو کل آپ نے چار دن کا نسخہ تجویز فرمایا ہے اسمیں یہ
نہیں بتایا کہ کھانے میں کس کس غذا سے پرہیز کروں لہذا میں نے نسخہ تو
پی لیا مگر شام کو کھانے کا ناغہ کر دیا یہ سوچ کر کہ کہیں بدپرہیزی نہ ہو
جائے حکیم صاحب کو غصہ تو بہت آیا مگر سوچ کر کہ عجب بے وقوف سے پالا
پڑا ہے مگر حکیم چونکہ غیر یورپی ڈاکٹر ہوتے ہیں اس لیئے انھوں نے غصہ
ضبط کر کے فرمایا کہ اف جناب کو بڑی زحمت ہوئی اتنی سی بات کے لیئے
اچھا تو بس آپ صرف تیل اور ترشی سے پرہیز رکھیئے اور باقی سب چیزیں
شوق سے استعمال کیجیے اب حکیم صاحب کی اس اجازت کے صاف معنے
یہ نکلے کہ جو چاہیں وہ آپ کھائیں۔ مگر آپ نے مارے مراق کے اب خود
حکیم کو ملزم نمبر ۱ قرار دیکر ان سے یوں جرح شروع کر دی۔
اور حکیم صاحب وہ آجکل الہ آباد کے امرود اگر کھاؤں تو خرابی تو نہیں،
مگر حکیم صاحب ترشی تو اون امرودوں میں بھی ہوتی ہے اور حکیم صاحب
وہ والدہ نے فرمایا تھا کہ لوکی کھانیکی اجازت بھی لے لینا۔ اچھا تو میں
نارنگی تو کھا ہی نہیں سکتا تو پھر وہ مٹھائی بھی نہ کھانا چاہئے کیوں کہ

یہاں تو سچ پوچھیے تو حکیم صاحب یوپی میں ایسی مٹھائی ملتی بھی نہیں اور یہ ہے کہ بڑا شہر ہے لاحول ولا قوۃ -

گر قبلہ وہ رات جو میں نے دوا پی تو کوئی نصف گھنٹہ کے بعد مجھے قدرے چکر سے محسوس ہوئے اور ....

اب آئے نفے صرف پرہیز کی غذائیں دریافت کرنے مگر بیماری کی تفصیل پھر سے شروع کر دی، غرض کوئی ایک گھنٹہ میں بہ دشواری تمام کا پیچھا چھوڑا تو عطار سے جا الجھے ایک ایک دوا کی اس سے تفصیل پوچھی جا رہی ہے دواؤں کی خاصیت سمجھی جا رہی ہے ان کے نئے اور پرانے ہونے کی تحقیق ہو رہی ہے اور دوسرے گاہک ہیں کہ عطار پر خفا ہو رہے ہیں کہ کس مخبوط الحواس سے الجھے ہوئے ہو ہیں تو دوائیں دیدو اب جو خدا خدا کرکے گھر پہونچے تو گھر بھر آپ کے مراق سے تنگ یعنی گھر میں اپنے مرض کی شدت اوسکی تکلیف اوسکی طوالت اور اسکی خطرناکی کو ایسے خوفناک الفاظ میں سناتے رہے کہ تمام گھر پریشان اور بیوی اگر تعلیم یافتہ نہ ہوئی تب تو اوس غریب کا چوبیس گھنٹہ ناطقہ بند دواؤں کو رکھنے اور اون کے بنانے میں لاکھوں احتیاطوں کی تاکید دوا پینے اور کھانے کے اوقات کی حد سے گذری ہوئی

پابندی دوا اُن کا اپنے سامنے تیار کرانا اور ہر دوا کی خاصیت اور
اسکی اصلیت سے بیوی بچوں کو واقف کرتے رہنا یہ آپ کے چوبیس گھنٹہ
کے خانگی مشاغل ہوں گے یعنی ہر وقت یہ وحشت سوار کہ مرض بڑھ تو
نہیں گیا اور اسوقت میری جو کیفیت ہے وہ نصف گھنٹہ پہلے کیوں نہیں
تھی، بس جہاں کوئی ادنیٰ تغیر بھی محسوس ہوا کہ اب آپ بغیر حکیم کے
نہ گھر میں ٹھہر سکتے نہ نوکری پر یعنی جس جگہ آپ کو اپنی طبیعت میں کوئی
فرق محسوس ہوا کہ آپ اسی جگہ سے حکیم صاحب کی خدمت میں روانہ
ہو گئے یہاں تک کہ اگر طبیعت پر بحالی محسوس ہوئی تو بھی حکیم صاحب
کی خدمت میں کھڑے حال بیان کر رہے ہیں اور وہ بھی عجیب عجیب قسم
کی تفصیلات سے، اور اگر آپ کسی کالج میں پڑھے ہوئے ہیں تب تو سمجھ
لیجئے کہ آپ کے مراقی علاج کے سبب سے گھر میں افلاس موجود رہیگا۔
یعنی آپ اپنی کالج زندگی کے باعث انگریزی علاج ہی شروع فرمائیں گے
لہذا دیئے جایئے پھر فیس پر فیس اور کمپاؤنڈروں کو انعام پر انعام اب
آپ کی جیب میں نسخوں کے ساتھ ہی سینے، کلیجہ، دل، جگر پھیپھڑے اور
آنتوں کے دیکھنے کے انگریزی آلات بھی رہیں گے اور حرارت دیکھنے کا

آلہ تو چوبیس گھنٹہ بغل سے جدا نہ ہوگا،
جب دیکھئے کھڑے ڈاکٹری معائنہ کرا رہے ہیں پیشاب اور خون کا معائنہ تو روزانہ کی بات ہے، اب جو مقامی ڈاکٹر سے تشفی نہ ہوئی تو کلکتہ اور بمبئی کے ڈاکٹروں سے علاج شروع ہے اور اگر خدا نے چند غریبوں اور مزدوروں پر حکومت بھی دے دی ہے تب تو آپ کا مراق پیرس اور لندن کے جاہی نہیں سکتا آئے دن ہیں کہ باہر سے قیمتی سے قیمتی دواؤں کے پارسل چلے آرہے ہیں، آپریشن پر آپریشن اور انجکشن پر انجکشن ہو رہے ہیں اور غریبوں مزدوروں اور کسانوں کے روپیہ سے آپ ہیں کہ مسوری شملے اور لندن تک ہیں کہ آب وہوا تبدیل کرنے چلے جا رہے ہیں اور وہ بھی سال میں دو دو مرتبہ مگر مراق ہے کہ بڑھتا ہی جاتا ہے محض اس لیے کہ جن غریبوں کی کمائی سے آپ مراق پریوں بے دریغ دولت صرف فرما رہے ہیں وہ ہیں کہ گلے پھاڑ پھاڑ کر بد دعا کر رہے ہیں حتیٰ کہ ایک دن تار آہی گیا کہ آپ پیرس کے سرکاری شفاخانے میں اِنّا لِلّٰہ ہو چکے خوشامدی اخباروں نے آپ کے نوحے چھاپ دیئے اور غریبوں نے پوشیدہ طور پر آپ کی وفات پر خوشی منائی اور اسطرح انگریزی وضع کا مراق ہمیشہ

کے لیے فنا ہوگیا،

اس مریض کی پہچان میں زیادہ تحقیق اور محنت کی ضرورت نہیں بلکہ اسکی صورت ہی مراق کا نمونہ ہوا کرتی ہے یعنی ان کے لباس میں کبھی نہ ترتیب اور باقاعدہ تہذیب نظر نہیں آتی یہاں تک کہ گرم کوٹ کی آستین سے قمیص کی آستین ہمیشہ باہر نظر آتی ہیں سر کے بال اول تو کبھی مشورہ سے صاف ورنہ پھر یہ خشک بال ہمیشہ فوجی سپاہیوں کی طرح سیدھے کھڑے رہتے ہیں آنکھوں کی وحشت اور گفتگو کا بے ربط ہونا بہت جلد بتا دیتا ہے کہ آپ مراق میں مبتلا ہیں،

اس مرض کا آخری دور نہایت شاندار ہوتا ہے یعنی شہر بازاروں اور سڑکوں پر لوگ ہیں کہ آپ کا مذاق اڑا رہے ہیں اور آپ ہیں کہ عجیب عجیب باتیں سنا رہے ہیں،

اس مرض کی چند نہایت نازک غیر محسوس اور ناقابل فہم اقسام اور بھی ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں کہ

اخلاق اور انسانیت کے نقطۂ نظر سے کتنا ہی غلط ہو مگر ایشیا اور افریقہ اور رس پہلے تو بحر منجمد شمالی کی تہ کو بھی فتح کرو اور شراب پیتے رہو اور یہ بھی نہ ہو تو کم از

ملک چین ہی کو فتح کرو اور زندگی کے مزے اڑاؤ،
ایک مراق یہ ہے کہ بلا سے جائیداد پر جائداد قرق ہوتی رہے مگر اخبار ہر حال میں جاری رہے،
بلا سے ملازمت جاتی رہے مگر ملا رموزی بنے رہو اور مضمون نگاری نہ چھوڑو،
بلا سے دنیا و انسانیت میں آپ کو قبرستان میں بھی جگہ نہ ملے مگر "دجی حضوری" کا پیشہ اختیار کیے رہو، اور خطابات حاصل کرتے رہو،
اور بلا سے بچے بھوکے رہیں مگر زیور پر زیور بنواتی رہو اور پہنتی رہو،
پس خدا ہر مسلمان کو اس مرض سے محفوظ رکھے آمین،

غنودگی

غنودگی کو تمام گل بنفشہ قسم کے حکیموں نے ایک بیماری تسلیم کیا ہے جو مزاج کی بے اعتدالی سے پیدا ہوتی ہے اور پیدا ہونیکے بعد اسکی عملی صورتیں وہ ہوتی ہیں جو اس مضمون میں آپ کو نظر آئینگی اور ویسے انسان کے اندر غنودگی بھی خدائے فیاض کی دی ہوئی نعمتوں میں سے وہ لطیف تر نعمت ہے جس کے شکر سے عہدہ برآ ہونا کم از کم ہمارے امکان سے تو قطعاً باہر ہے۔ دنیا کے عظیم الشان مدبر۔ جلیل القدر سپہ سالار۔ باوقار علماء صاحب عظمت وزرا۔ اور شوکت پناہ شہنشاہ سب اس نعمت سے بقدر ظرف بہرہ یاب ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ یعنی "اونگتے ہیں" غلط ہے۔ کہ اس کیفیت کا نمایاں اثر صرف افیونی حضرات پر زیادہ ہوتا ہے یہ بھی صحیح نہیں۔ کہ گانجہ۔ چرس اور بھنگ اس تاثیر کے محرک ہیں بلکہ یہ جان پرور کیفیت ان سب کی امداد بغیر پیدا ہوتی ہے۔ اور جب پیدا ہوتی ہے۔ تو انسان دنیا و مافیہا سے یک لخت ....

....

اس کمترین نے جہاں تک غور کیا غنودگی کا تعلق تین چیزوں سے
بہت کافی پایا۔ عمر۔ موسم۔ اور قوائے جسمانی۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ
پچاس برس کی عمر کے بعد سے لوگ دیوار کے سہارے بیٹھے بیٹھے اونگھا

اگر انہیں کسی نے زور سے آواز دی تو نیم باز آنکھوں سے ذرا دیکھ لیا اور پھر

موسمی لحاظ سے غنودگی کا غلبہ گرمی کے موسم میں خاص شدت اختیار
کر لیتا ہے۔ اکثر یہی ہوا ہے کہ کھانا کھا کر پلنگ تک جاتا محال ہو گیا ہے
اور بعض بزرگ تو دسترخوان پر ہی ....

....

مگر قوائے جسمانی کے لحاظ سے مذکورہ دونوں اصول غلط ثابت ہوتے
ہیں جبکہ ہم ریل گاڑی میں معاملہ اس کے بالکل برعکس پاتے ہیں۔
چنانچہ آپ ریل گاڑی میں چاہے جس قدر نوجوان اور تندرست آدمی کو
سوار کر دیجئے۔ اور چاہے جس موسم میں سوار کر دیجئے وہ ایک اسٹیشن
تک تو کھڑکی سے مناظر قدرت کی سیر میں مصروف رہیگا۔ مگر تو دوسرے

اسٹیشن سے تیسرے اسٹیشن تک کے درمیانی فاصلے میں کم از کم ایک سو کلومیٹر تھا

....

اگر اسٹیشن پر گاڑی تین منٹ ٹھہرے گی" کی آواز سے وہ بیدار بھی ہو جاتے
تو گاڑی روانہ ہوتے ہی وہ پھر ....

....

غنودگی کا غلبہ یوں تو بے حد راحت بخش اور حلاوت اندوز ہے لیکن
یہ بعض جگہ نہایت نقصان رساں بلکہ توہین انگیز ہوتا ہے جہاں
غنودگی کے پہلے ہی حملہ میں بستر اور صندوق ندارد اور اس سے اللہ
بچائے ہمارے بڑے مولوی صاحب ریل میں اپنا صندوق اپنے کمر بند
سے باندھ کر بیٹھتے تھے دوسرا نقصان مطالعہ کے وقت ہوتا ہے جہاں
آپ نے کتاب کا صفحہ ڈیڑھ صفحہ پڑھا کہ ....

....

خصوصاً ایسے طلبہ پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے جو انٹرنس کے امتحان کی
لیے تیاری میں مصروف ہوتے ہیں اگرچہ نوجوان طلبہ بھی اس کے انسداد
کی تدابیر اختیار کرتے ہیں مگر سب بے سود مثلاً ہمارے ایک مستعد شاگرد

نے غنودگی سے تنگ آکر کرسی پر بیٹھ کر پڑھنا شروع کیا۔ لیکن اس حد تک مفید ثابت ہوا کہ وہ مسلسل بارہ صفحات پڑھ گیے۔ لیکن اس کے بعد کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مع کرسی ....

....

غصہ میں آکر انھوں نے دوسری تدبیر اختیار کی یعنی اس مرتبہ انھوں نے انگریزی کرسیاں پھینک کر مشرقی قالین کے فرش پر بیٹھ کر پڑھنا شروع کیا جس کے معنی یہ تھے کہ غنودگی کا کوئی حملہ کامیاب نہیں ہوگا بے شبہ وہ دیر تک پڑھتے رہے۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے صرف دونوں کہنیاں قالین پر جما دیں پھر آہستہ سے دونوں پاؤں پھیلا دیے اور مطمئن تھے کہ غنودگی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی کہ ....

....

ہنسے جاکر دیکھا تو کتاب پر سر دھرا ہوا تھا اور خود ....

....

بیدار کیا تو جھنجھلا کر رہ گئے اور منہ ہاتھ دھو کر آگئے اور اس مرتبہ بہت زور سے چلا چلا کر پڑھنا شروع کیا مگر ابھی آوازیں کوئی دل پسند سُر

بھی پیدا نہ ہوا تھا کہ ....

....

یہ تو تھے غنودگی کے نقصان رساں پہلو۔ توہین انگیز پہلو نماز باجماعت اور محفل وعظ و میلاد میں دیکھے گئے ہیں۔ مثلاً موسم گرما کی نماز ظہر میں امام صاحب طویل تر سورت پڑھتے ہیں۔ لہٰذا اگر آپ مسجد کی صف میں کسی معزز آدمی کے برابر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے تو سمجھ لیجیے کہ توہین ہو کر رہے گی۔ مثلاً جہاں امام صاحب الحمد شریف سے آگے بڑھے تو آپ کو تمام جسم میں ایک سنسنی محسوس ہوگی تو آپ ایک پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے اور دوسرے پاؤں کو آرام دینے لگے۔ لیکن سنسنی بڑھتی جائیگی اور آپ کی گردن خود بخود گریبان کی طرف جھک جائیگی۔ پھر کچھ دیر بعد آپ نیت باندھے پاس والے نمازی پر دھڑا دھڑ ....

....

اب اگر اس حالت میں امام نے رکوع کیا تو آپ کو رکوع کرنا محال سا معلوم ہوگا۔ مثلاً آپ نیت کے ہاتھ تو چھوڑ دیں گے مگر رکوع کے لیے خمیدہ ہونا معلوم۔ اسی طرح پہلے سجدہ کے بعد جب امام صاحب ہاتھوں کو دوسرے

سجدہ میں جانے کے لیے جنبش تو دیں گے مگر وہیں ہی ہیں ......

....

پھر سر اوٹھا کر کچھ پڑھنا چاہیں گے کہ ....

....

یہاں تک کہ امام صاحب سجدہ سے سر اوٹھائیں گے تو آپ گھبرا کر یا تو سجدہ میں بغیر امام کے چلے جائیں گے یا نادم ہو کر ایک ہی سجدہ پر قناعت کرلیں گے اور یہیں تو نماز باجماعت میں غنودگی کا یہاں تک تجربہ ہے کہ امام صاحب نے نماز ختم کرتے ہوئے کہا۔ السلام علیکم و رحمتہ اللہ مگر یہاں قاعدہ آخر ہی میں بیٹھے رہے۔ جب پاس والے نمازی نے کہنی مار کر بیدار کیا تو معلوم ہوا کہ نماز ختم ہوگئی مگر فوراً سبحان اللہ اور الحمد للہ کہہ کر غنودگی کی خفت کو کم کیا جو ناکام رہی اور اللہ بخشے مولوی صاحب چلا کر کہتے تھے کہ جب ایسی ہی نیند آتی ہے تو جماعت سے نماز ہی کیوں پڑھتے ہو؟ اور امرا نے شاید اسی لیے نماز باجماعت ترک کردی ہے

وعظ یا میلاد کی محفل میں اگر کہیں جگہ ناکافی ہو اور لوگوں میں گھس کر بیٹھ جایئے اور وعظ کہنے والے قسمت سے بریلی - بدایوں - مرادآباد

یا دیوبند کی طرف کے ہوں تو پھر دس بجے رات کے بعد سے غنودگی کا سلسلہ یقینی طور پر شروع ہو جاتا ہے اور لوگ پہلے آہستہ سے آنکھیں کھولنا اور کبھی بند کرنا اختیار کرتے ہیں اور اگر کسی ایسی جگہ بیٹھ گئے جہاں محفل کی روشنی چہرے تک نہیں آتی تو پھر غنودگی نہایت اطمینان سے آپ کی گردن کو گریبان کی طرف جھکا دیتی ہے پھر دونوں گھٹنے کھڑے کر لیے جاتے ہیں اور اون پر دونوں ہاتھ رکھے جاتے ہیں اور اب جیسے ہی گردن جھکائی کہ ....

....

آنکھ کھلی تو کہا سبحان اللہ اور پھر ....

....

اس موقعہ پر سبحان اللہ کے یہ معنی ہوا کرتے ہیں کہ ہم وعظ بہت غور سے سن رہے ہیں۔ اونگتے نہیں ہیں حالانکہ کچھ نہ کچھ ....

....

تا آنکہ وعظ ختم ہو گیا لیکن یہاں رہیں کہ ....

....

اور اگر وعظ والے مکان میں غنودگی کے وقت سہارے کے لیئے کوئی دیوار ہاتھ آگئی تو پھر تمام محفل والے اپنے اپنے گھر جا پہونچے۔ لیکن یہاں دیوار سے تکیہ دیئے ....

آخر کار صاحب مکان آتا ہے اور کہتا ہے اٹھیئے حضرت تبرک لیجئے تب کہیں ایک بڑی سی جماہی لیکر لاحول دلا کہتے ہیں اور با دل ناخواستہ گھر تک آنا پڑتا ہے ـ

ہم کوئی حیدر آباد کے وظیفہ یافتہ یا منصب دار اہل قلم تو نہیں ہیں کہ فکر معاش سے بالکل آزاد رہکر دن کی بہترین روشنی میں انشاء پردازی فرماتے رہیں بلکہ دن بھر تو رہتے ہیں دفتر کے "منشی جی" ادھر شب کے ابتدائی حصہ میں ننھے میاں کو کھلاتے رہتے ہیں جب وہ سوجاتے ہیں اور وہ بھی سوجاتی ہیں تو آنکھ بچا کر مضمون شروع کرتے ہیں ـ اور کوئی ایک آدھ اوپر تلیں اخباروں اور رسالوں کے لیئے اسوقت مضامین تیار کرتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ شب بیداری سے خدا معاف کرے صبح کی نماز

....

مگر اس کو کیا کہیئے کہ دین و دنیا کی وجہ نجات محترمہ والدہ صاحبہ اذان

کے وقت سے اُٹھانا شروع کر دیتی ہیں۔ ادھر ممدوحہ کا اثر اور رعب اس قدر ہے کہ چوں نہیں کر سکتے جہاں ممدوحہ نے آواز دی "بھیا!" اور ہم فوراً "جی بہت اچھا" کہہ کر چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گئے اور آنکھیں مل کر دیکھا۔ کہ اماں بی کدھر ہیں۔ اگر وہ اپنے کمرے میں نماز کے لیے تشریف لے گئیں تو اب غنودگی نے ہمیں آلیا۔ اور ہم نے پھر تکیہ کی طرف رخ کیا اور درمیان ہی میں ....

....

مگر اماں بی بھی خوب جانتی ہیں کہ ہم آدھ گھنٹہ تک اونگھتے رہتے ہیں اس لیے وہ بھی آوازوں کا تانتا۔ باندھ دیتی ہیں جہاں ہمیں دیکھا کہ ہم ....

....

کہ انہوں نے فوراً کہا "ہوں۔" اور ہم فوراً تیزی سے ہشیار تو ہو گئے مگر پھر ....

اب چارپائی سے نیچے پاؤں لٹکا دیے۔ مگر آنکھیں بند اور ....

....

کہ پھر انہوں نے پکارا "بھیا سورج نکلنے والا ہے۔" اب ہم نے تکیہ کو پاؤں پر رکھ کر جھومنا شروع کیا۔ کہ پھر "بھیا!" اور ہم فوراً سنبھل گئے۔ ایک مرتبہ منہ

پر ہاتھ پھیرا۔ کبھی ڈاڑھی کی طرف ہاتھ لے گئے کہ پھر ....

....

یہاں تک کہ اب ننھے کی اماں نے ہمارے پاس پانی کا لوٹا بھی لاکر رکھ دیا تو ہم نے انہیں بہت غصہ سے دیکھا مگر انھوں نے اماں بی کو سنانے کے لیے مسکرا کر اور بھی زور سے کہا۔ اٹھتے کیوں نہیں ہو بیٹھے اونگھ رہے ہو۔ وہ تو یہ کہہ کر گھر میں بھاگ گئیں۔ اور ہم جھنجھلا کر لوٹا ہاتھ میں لیے گھر سے "میونسپل بورڈ" کی طرف چلے۔ اب حسب دستور عام صبح چونکہ یہ گھر کے میونسپل بورڈ میں حاجتمندوں کی کثرت ہوا کرتی ہے۔ لہذا اگر اندر سے کسی کے کھانسی کی آواز آگئی تو ہم وہیں لوٹا ہاتھ سے رکھ کر بیٹھ گئے اور لگے

....

یہاں تک کہ خاصی صبح ہوگئی۔ اور ہم ....

....

غرض دعا ہے کہ خدا صبح کی غنودگی سے ہر شریف آدمی کو بچائے اگر دہلی کے بڑے

....

حکیم جی اس کا کوئی نسخہ تجویز فرمائیں۔ تو ایک بوتل کے خریدار ہم بھی ....

دردِ دل

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

فارسی زبان میں یہ مرض اس طرح ہوتا ہے کہ اگر کسی حکیم سے علاج کے خیال سے اس کا تذکرہ بھی کر دیا جائے تو مریض کی زبان جل جاتی ہے اور اگر اس کا تذکرہ نہ کیا جائے اور اس کی تکلیف کو برداشت کرنے کا ارادہ کیجیے تو اس سے ہڈیوں کے اندر والے گودے تک کے جل جانیکا ڈر پیدا ہوتا ہے۔

مگر زبانِ اردو میں یہ مرض اکثر اوقات نہایت مزا دیتا ہے البتہ اس کے پیدا ہونے کے اسباب میں کافی سے زیادہ اُلٹا پن پایا جاتا ہے یعنی حکیموں کے خیال میں تو یہ مرض بھی عام صحت کی کمزوری اور مزاج کی بے اعتدالی سے پیدا ہوتا ہے اور خصوصیت سے اس سنہ ۱۹۱۳ء عیسوی کے زمانے کے نوجوانوں کو بہت زیادہ ہوتا ہے اور اس کی پیدائش کی جگہ انگریزی زبان کے مدرسے کالج اور بورڈنگ ہوتے ہیں اور ان لوگوں کے

علاج میں، حکیم عامل کریم الدین لاہوری، پیر جی عامل لکھنوی، اور دوسرے پیروں ولیوں، صوفیوں، قطبوں اور تعویذوں کو بڑا دخل ہے مگر اصل یہ ہے کہ یہ مرض عقل کی بلندی، احساس کی تیزی اور علم و فضل کی صحیح روشنی سے زیادہ پیدا ہوتا ہے مسلمانوں میں جب سے علوم اسلام کی تعلیم کو ترک کر کے انگریزوں سے بات چیت کرنیکے لئے انگریزی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا اس وقت سے خصوصیت سے یہ مرض مسلمان دولت مندوں میں زیادہ پھیل گیا یہاں تک کہ ان ہندوستانی دولت مندوں کے علاج کے لئے یورپ کے ہر شہر میں اس کے شفا خانے بنانے پڑے خاص کر ان کا علاج لندن اور پیرس میں بڑی خوبصورتی سے ہوتا ہے۔

مسلمان سیٹھوں اور مہاجنوں میں علوم کی کمی کے باعث عقل سلیم ہمیشہ کم ہوتی ہے مگر دوسروں کی کمائی کا روپیہ ان کے قبضہ میں کافی ہوتا ہے جسے یہ طبقہ اپنے باپ دادا کی جائداد سمجھکر خرچ کرتا ہے۔ پس دولت کی اس کثرت سے انہیں یہ مرض لاحق ہوتا ہے بلکہ اکثر انہیں لاحق نہیں ہوتا تو لاحق کرایا جاتا ہے"

جس کا طریقہ یہ ہے کہ ان مہاجنوں کے پاس ایسے کم نصیب لوگ

ملازم رہتے ہیں جنھیں بغیر ملازمت کے روٹی نہیں مل سکتی پس یہ اپنی روٹی، کوٹھی
اور موٹر کی خاطر اپنے آقا کے دل کے بالکل بیچ میں یہ درد پیدا کرا دیتے ہیں
اس طرح کہ انہیں یقین دلاتے ہیں کہ آپ کے حسن کے برابر شاید ہی
کسی دوسرے کو حسن ملا ہو وہ دیکھئے تاکہ لندن کے اخبار اور فوٹو گرافر
حضور کے فوٹو کے لیے اس دن کس بے خودی کے ساتھ آپ کا موٹر گھیرے
ہوئے تھے اور ہاں وہ خوب یاد آئی کہ اس نے آپ کو سوائے ہوٹل پیرس میں
دعوت بھی تو دی تھی اور واللہ جب وہ بھی اپنے وقت کی "ملکہ جمال ہے"
بس اتنے تذکرہ سے حضور کے دل میں یہ مرض پیدا ہو جاتا ہے ابتدا میں تو
اس سے خط و کتابت تار بازی اور پیغام بروں کا سلسلہ جاری رہتا ہے
جس پر غریبوں کی آمدنی کے ہزاروں روپیہ بے دریغ خرچ کر دیئے جاتے
ہیں، لیکن مرض میں افاقہ کے عوض زیادتی ہوتی ہے تو پھر ملازمین میں سے
بعض لوگ ان کے "خفیہ کارکن" بن جاتے ہیں جن میں اچھے اچھے بی، اے
اور ایم اے، پاس ہوتے ہیں مگر محض دولت کمانے کی خاطر یہ لوگ ان
مہاجنوں کے اس مرض کے علاج کے لئے ذلیل سے ذلیل حرکات پر
اتر آئے ہیں۔

ادہر تو یہ ہوتا ہے کہ مریض درد دل کی اعلیٰ درجہ کی کوٹھی میں اعلیٰ درجہ کی مسہری پر اعلیٰ درجہ کے بجلی کے پنکھوں اور بجلی کی روشنی میں بیٹھے اس درد کی یاد میں ہارمونیم اور فونوگراف باجے بجاتے رہتے ہیں اور ادہر جب اوس درد دل کو یقین آجاتا ہے کہ فلاں دولت مند میرے خیال میں مبتلا ہو چکا ہے تو پھر وہ بھی لنڈن پیرس اور بنارس کی تمام نقاشیوں کو صرف کر کے ان کے درد میں اضافہ کرنے پر تل جاتی ہے، اس درد کا پہلا دورہ یوں پڑتا ہے کہ دولت مند صاحب غریبوں کی کمائی کے کئی ہزار روپیہ نقد لیکر اپنے ضمیر اور عزت فروش خدام کے ساتھ وطن سے بغرض تبدیل آب وہوا اوسی شہر میں جاکر مقیم ہوجاتے ہیں جہاں ان کی۔ درد دل رہتی ہیں۔ پھر قیام بھی ویسے ہی کی شان کے ہوٹل میں ہوتا ہے۔ اور اب ہوٹل والوں سے لیکر اس شہر کے بھنگیوں، دہوبیوں، نائیوں، اور قلیوں تک پر خوب روپیہ برسایا جاتا ہے تاکہ ان کی۔ درد دل" کو معلوم ہوجائے کہ ان کا مریض بڑی شان والا ہے، پس ان کی اس حرکت سے اوس شہر کے لُچّے، شہدے، مگر فیشن ایبل بدمعاش ان کی بیمار داری کے لئے اپنی خدمات پیش کرتے ہیں اور دولت مند مریض صاحب ان کے ہر جھانسے میں بخوشی پھنس جاتے ہیں

محض اس لیئے کہ غریبوں کی کمائی کی خاص رقم انکے بکس میں موجود رہتی ہے، پس یہاں سے مریض اور درد دل کے درمیان شاندار پیغام بازی شروع ہوجاتی ہے جس میں قسم اول کے موٹر کاریوں دوڑتے ہیں کہ جنہیں آپ کو صحیح وسلامت گذرنا محال ہوجاتا ہے اس پیغام بازی میں جو لوگ کام کرتے ہیں وہ انگریزی لباس میں رہتے ہیں اور انکے پاس بے شمار نوٹ اور ریوالور بھی رہتے ہیں جب بہم ہوتا ہے تو درد دل بھی نہایت آراستہ پیراستہ ہوکر کوٹھے پر نظر آنے لگتی ہیں کیونکہ اکثر ہندوستانی دولت مندوں کی درد دل دہلی کے چاوڑی بازار آگرہ کے کناری بازار، لاہور کے ہیرا منڈی بازار اور بمبئی کی سفید گلی ہی میں رہنے والی ہوتی ہیں اور بعض کی لندن یا پیرس میں اور حال ہی میں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ملک اٹلی کی پیداوار میں بھی یہ تاثیر پیدا ہو چلی ہے

غرض آپ تو رات کے وقت بھی چاوڑی بازار سے گذرنا ایشیائی اور اسلامی حیا وتہذیب کے خلاف سمجھیں گے مگر ان مریضوں کے موٹر کار اس بازار میں دن کے وقت بھی کھڑے ہوئے پائے گیئے

ہیں، اب جب لاکھوں روپیہ کے قریب درد دل تسخیر فرمالیتے ہیں
تو پھر مریض درد دل صاحب سے ہلکی سی رسم وراہ شروع ہوتی ہے
مگر اتنے عرصہ میں پینامبر لوگ تار کے ذریعہ مریض کے وطن سے کچھ
لاکھ سوا لاکھ روپیہ منگا لیتے ہیں اور پھر علاج شروع ہو جاتا ہے، اس
علاج میں عورتوں کی برہنہ تصاویر، گراموفون باجہ، داغ و امیر کی عاشقانہ
غزلیں، رنڈیوں کا ناچ گانا، اردو کے رسالوں کے عریاں افسانے، اکسیر اعظم
کا کام دیتے ہیں اور مریض کو خاصہ افاقہ ہوتا رہتا ہے مگر درد دل بالکل
ہی نہیں جاتا بلکہ مریض کی حالت اندر ہی اندر خراب ہوتی جاتی ہے
ادھر تو یہ علاج دہلی، لاہور، آگرہ اور بمبئی میں ہوتا رہتا ہے اور ادھر
مریض کی بیوی کو اس مرض کا علم ہوتے ہی دق کا مرض پکڑ لیتا ہے جس
سے نجات کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں یا تو یہ بیوی خدا گنج کا راستہ اختیار
کرتی ہے یا پھر وہ بھی کسی ڈرائیور یا گھر کے ملازم کو اپنا درد دل بنا کر بیمار
ہو جاتی ہے اور اچھی بھی ہو جاتی ہے

اس مرض پر جب درد دل کے دورے پڑتے ہیں تو وہ بجائے یا خدا
یا اللہ کہنے کے عاشقانہ اشعار پڑھتا ہے، ناولیں اور افسانے دیکھنا

ہے یا سنتا ہے یا پھر غریبوں کی کمائی کے روپیہ سے ایک ایک دن
میں دس دس مرتبہ اعلیٰ درجہ کے کپڑے بدل کر ایک اعلیٰ درجہ کے موٹر
میں بیٹھکر اپنے دردل کی کوٹھی یا کوٹھے کے آس پاس چکر لگاتا رہتا
ہے، تب اسے سکون ہوتا ہے یا پھر اپنے دردل کے لئے ہزاروں
روپیہ کے ولایتی زیور، کپڑے، پھل اور وغیرہ وغیرہ بھیجنے میں مصروف
رہتا ہے تب اسے قدرے سکون ہوتا ہے اور اس عرصہ میں پھر تار کے
ذریعہ وطن سے ہزاروں روپیہ منگا لیتا ہے
اول تو اس مریض کا جسم بھی نہایت ہٹا کٹا اور تندرست رہتا ہے لیکن
پھر بھی رات اسے نیند نہیں آتی تو یہ مریض اس شعر کو زیادہ پڑھتا رہتا ہے
؎ اک ہوک سی دل میں اوٹھتی ہے اک درد سا پیدا ہوتا ہے
ہم راتوں کو اوٹھکر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے !!
اس مریض کو پرہیز میں یہ چیزیں بتائی جاتی ہیں۔ کہ
اس مرض کی اطلاع گھر بھر میں کسی کو نہ وطن والوں کو معلوم نہ ہونے
پائے خصوصًا ماں باپ کو، بیوی سے ہمیشہ علحدہ رہا جائے اور اگر وہ
خود بے غیرت بن کر پاس آجائے تو اس سے اس درجہ غصے یا افسردگی

سے بات کہجارے کہ پھر اسے دوبارہ پاس آنے کا حوصلہ نہ ہو۔ اپنے ذمہ کا کوئی ایک کام خود نہ کیا جائے بلکہ سارا کاروبار نوکروں پر چھوڑ دیا جائے اور خود درد دل کی یاد میں مسہری پر پڑا رہنا چاہیے۔

جب اس درد کے متعدد دورے پڑ جاتے ہیں تو پھر مریض کے کارکن پی/ لے/ پاس اوسے حکیموں کی طرف رجوع کرتے ہیں جن کی ہاں ایسے مریضوں سے ملنے اون کے قیام کرانے ان سے رازمیں مرض کی تفصیل سننے کے لیے نہایت شاندار کوٹھیاں اور کرے بنے ہوئے ہیں اسیطرح اس قسم کے مریضوں کے لیئے ان حکیموں کے ہاں دوائیں بھی اتنی قیمتی تیار ہونے لگی ہیں کہ ایک تولہ کی قیمت سے آدھا دیہات خریدا جاسکتا ہے اسیطرح ان مریضوں کے حکیم ریل کے فرسٹ کلاسوں میں بلائے جاتے ہیں ورنہ ہمارے آپکے زمانے میں بڑے بڑے حکیم لوگ بیچارے کھانستے ہوئے یا پیدل/ پالکیں میں آیا جایا کرتے تھے اور بڑی سے بڑی دوا ٹکے ڈیڑھ ٹکے کی بتا جاتے تھے مگر جب سے اس قسم کے مریضوں کی کثرت ہوئی ہے اسوقت سے ان بوڑھے سے بوڑھے حکیموں کے گالوں پر گوشت اور سرخی اتنی زیادہ

ہو گئی کہ دیکھئے اور حکیم صاحب کی آمدنی کی مقدار کو سمجھ جایئے اور مشہور یہ ہو رہا ہے کہ "دیسی طب" ترقی کر رہی ہے

القصہ اس قسم کے مریض کی حالت اسوقت نہایت ناگفتہ بہ ہوتی ہے جب اسکی درد دل لاکھوں روپیہ کا صفایا بول کر فرار یا ناراض ہو کر کسی فلم کمپنی کی مالک بن جاتی ہے۔ لہذا اسوقت شہر بمبئی یا شہر میرٹھ میں ریوالوروں کے ذریعہ دو چار صدقے کے بکرے چڑھائے جاتے ہیں اور بیوقوف لوگ اڑا دیتے ہیں کہ "قتل ہو گیا"

ان مریضوں کے بعد دوسرے قسم کے مریض آجکل کے انگریزی طلبہ ہوتے ہیں جنھیں چھٹی ساتویں جماعت ہی سے یہ درد پکڑ لیتا ہے جسکی پہلی علامت یہ ہوتی ہے کہ مریض ہر سال امتحان میں ناکام رہنے لگتا ہے دوسری علامت یہ ہوتی ہے کہ اسکی ہر کاپی پر عشقیہ غزلیں اور اشعار نقل کیئے ہوئے ملتے ہیں اس مریض کی دوا اکثر "گرلس اسکول کے قریب" ملتی ہے یا پھر اسی کی جماعت میں ہوتی ہے بس اس مرض کے پیدا ہوتے ہی لڑکے کی حالت کم عمری کے باعث اتنی زیادہ خراب

ہو جاتی ہے کہ محلے والے تک سمجھ جاتے ہیں کہ یہ بیچارا درد دل میں مبتلا
ہو گیا ہے پس یہ مریض اس درد سے شفا پانے کے لیے پرانے رنگ
کے مولویوں اور جاہلوں کے بتائے ہوئے عمل زیادہ استعمال کرتا ہے
جب دیکھو کمرے میں بیٹھا کوئی نہ کوئی وظیفہ پڑھ رہا ہے اور نام یہ کہ امتحان
کی تیاری کر رہا ہے اس کے درد دل کو اس کے ساتھ کے طلبہ بہت جلد
تاڑ جاتے ہیں اور دن بھر اوسکا نام لیکر اسے چڑاتے پھرتے ہیں یہ مریض
اکثر اشتہاری تعویذ اور عمل زیادہ خریدتا ہے اس کے پاس حکیموں اور
یونانی شفاخانوں کی فہرستیں بھی زیادہ ملتی ہیں ایک اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ
شاعر بن جاتا ہے اور رسالے والے اسکی عشقیہ غزلوں سے تنگ آجاتے ہیں
اور اگر اسمیں کا کوئی مضمون نگار بن جاتا ہے تو وہ سب سے پہلے ٹیگور
کے رنگ کے مضامین لکھتا ہے اور رسالہ "نگار لکھنؤ" کے مضامین کو زیادہ
پسند کرتا ہے اس کا درد دل جہاں رہتا ہے یا رہتی ہے؟ اوس کے
مکان کے پاس زیادہ گھومتا ہے مگر اسے مارے درد کے کسی طرح چین
نہیں آتا بے ذریعہ ہونیکے باعث اس کے درد دل کو اکثر خبر بھی نہیں ہوتی
کہ فلاں طالب علم درد میں مبتلا ہے اسی طرح یہ کم عمری کے باعث اس درد

سے کے اظہار میں ذرا شرماتا بھی ہے مگر جب اس پر زور و شور کا دورہ پڑتا ہے تو اس کی بدحواسی اور پریشانی سے اس کے ساتھی لڑکے اور اس کے ماں باپ تاڑ جاتے ہیں مگر ہمدردی یوں کرتے ہیں کہ سب طرف سے اسے گدھا، بے وقوف، احمق، الّو، خبطی، آوارہ، بدچلن اور بدکردار کہا جاتا ہے۔ مگر یہ نمازیں اور وظیفے پڑھ پڑھ کر جھینپتا ہی رہتا ہے

اس درد کی شدت کی ایک خاص علامت یہ ہوتی ہے کہ یہ اپنی دردِ دل کی تصویر کو ہر لمحہ اپنی جیب اپنی گٹھڑی یا اپنی کتاب میں رکھتا ہے اور دردِ دل کے نام کے مخفف حروف کو اپنے ہاتھ پر نیلی روشنائی سے لکھ لیتا ہے بعض طلبہ اس نام کو ہاتھ کے چمڑے میں پیوست کر دینے کے لیے آگ سے جلا دیتے ہیں، اس قسم کے مریض درد کی شدت سے آوارہ اور واہی تباہی بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ خصوصیت سے تعلیم کا سلسلہ برباد ہو جاتا ہے اخلاقاً تو یہ نہ دین کے رہتے ہیں نہ دنیا کے اگر درد کا نتیجہ بھی بہت جلد بر آمد ہو جاتا ہے جس کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ دردِ دل چند برس بعد خود ہی کافور ہو جاتا ہے ایسا کہ پھر قسم کھانے کے قابل بھی باقی نہیں رہتا، یا پھر افلاس، کم علمی، اور حماقت کی کثرت سے ریل کے سامنے

لیٹ کر کوئیں میں گر کر، افیون کھا کر یا کوئی انگریزی زہر کھا کر ختم ہو جاتی ہیں اور پولیس والے حسد اور رشوت نہ ملنے کے باعث مشہور کر دیتے ہیں کہ فلاں لڑکے نے خودکشی کر لی اور جیب سے ایک خط بھی برآمد ہوا۔

ان اقسام کے بعد اس درد کی ایک قسم ایسی ہوتی ہے جس کو مریض کو مریض کہنے کے عیوض مریضہ کہتے ہیں اور اسی میں یہ مرض پایا جاتا ہے اس مریضہ کو یہ درد ۱۳ برس کی عمر سے لاحق ہوتا ہے اور اس مرض کا حملہ یا آغاز خود مریضہ کے حسن و جمال سے ہوتا ہے جیسے آجکل کے فیشنی لباس، کلب، ٹھنڈی سڑک، سینما، اردو کے رسالوں کی نصاویر اور عشقیہ مضامین سے، اور ہاں اشعار سے بھی، اور ہاں اسکولوں سے بھی اور کالجوں سے بھی، غرض جب اسکی ابتدا ہوتی ہے تو مریضہ پہلے تو اسے ضبط کرتی ہے۔ مگر موجودہ زمانے میں مشرقی علوم و آداب کی تباہی کے باعث اسے زیادہ حیا اور شرم سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیئے کہ اس درد کے پیدا ہونے کے اکثر اسباب اور مواقع آجکل کے فیشن ایبل ماں باپ اور بھائی ہی جمع کر دیتے ہیں

پس مریضہ فوراً ہی اپنے دردِ دل کو خط لکھتی ہے جسکی ابتدا تو بڑی نیک
خیالی سے ہوتی ہے مگر انتہا اکثر شفایابی پر ہوتی ہے "رفتہ رفتہ بہم شود
درماں" کے قاعدے سے یہ اپنے دردِ دل کو خود ہی پالیتی ہے
جب سے اس درد کا دورہ پڑتا ہے تو یہ ہارمونیم اور فوٹوگراف سے
دل بہلاتی ہے، پھر تصویر سے پھر آئینے کے سامنے بیٹھکر اپنے سر کے
بالوں اور چہرہ کی آرائش سے پھر رسالوں کے عشقیہ مضامین سے
دوسرے دورہ پر یہ خود شاعر ہو جاتی ہے یا مضمون نگار۔

. . . .

. . . .

. . . .

یورپ میں تو ایسی مریضہ کو
حق دیا گیا ہے کہ اسے جسوقت کبھی یہ درد شروع ہو وہ آزادی سے
چلائے چیخے اور تڑپے اور آہ کرے مگر ہندوستان میں بی اے
اور ایم اے پاس اسی رفتار سے پیدا ہوتے رہے تو کم از کم دس

برس اس مریضہ کو ضبط کی تکلیف ہوگی اور دس برس بعد یہاں بھی ایسی مریضہ آزادی سے چلا سکی گی کہ ہائے رے مری" پچھلے زمانے میں اس مرض کی مریضہ روز بروز گھلتی جاتی تھی اور تپ دق میں مبتلا ہو جاتی تھی مگر اس زمانے کی مریضہ اس درد کے دورہ سے زیادہ خوش ہوتی ہے ہر وقت مست اور مخمور سی نظر آتی ہے، شوخیاں اور اٹکھیلیاں بڑھ جاتی ہیں ساری سہیلیوں میں سب سے زیادہ تیز باتیں کرتی ہے۔ بات بات پر کھل کھلاتی ہے اور جب درد کی شدت ناقابل برداشت ہو جاتی ہے تو گھر بار چھوڑ چھاڑ کہیں چلی جاتی ہے اور شہر کے مخالف مشہور کر دیتے ہیں کہ "فرار ہو گئی" یا "اغوا" کہیں کہیں افیون کھا کر یا کپڑوں میں آگ لگا کر اس کا علاج کر لیتی ہے۔ مگر بہت کم۔

اب وہ جو اوپر لکھا تھا کہ یہ مرض اصل میں عقل کی بلندی احساس کی تیزی اور علم و فضل کی لاجواب صلاحیت سے بھی پیدا ہوتا ہے تو اسکی بیشتر مثالیں تو یہیں لوگ ہیں ۔

رئیس اعظم غازی مصطفےٰ کمال پاشا۔ ہز مجسٹی رضا پہلوی شاہ ایران
سلطان المعظم غازی عبدالعزیز ابن سعود شاہ نجد و حجاز۔ رئیس اعلی
غازی احمد اسکندر زغو پاشا شاہ البانیہ

یعنی ان لوگوں کا درد دل یہ تھا کہ یہ لوگ اپنی قوم اور سلطنت کو جب
غیر قومی لوگوں کے اثر میں پاتے تھے تو مارے درد کے بےچین ہو جاتے
تھے اور اب جو یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے تو گویا ان کا درد دل
جاتا رہا۔ اور انھیں غسل صحت نصیب ہوگیا۔

دوسرے درجہ میں یہ درد ان لوگوں کو ہوتا ہے جن کے نام مولینا محمد علی
علیہ الرحمہ مولینا ظفر علیخاں مولانا شاہ عطاء اللہ بخاری۔ مفتی محمد کفایت اللہ
مفتی اعظم ھند ہیں۔

اور تیسرے درجہ میں یہ درد ان لوگوں کو ہوتا ہے جن کے نام خواجہ حسن نظامی
مولوی راشد خیری دھلوی اور ملا رموزی ہوتے ہیں ان میں سے ایک کا درد
دل تو فرید ون فر آصف جاہ نظام دکن کی اردو نوازفیاضیوں سے کافی حد
تک کم ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے کا درد رسالہ "عصمت" کے ذریعہ
کبھی کم ہوتا ہے اور کبھی معتدل،

اب رہے مُلّا رموزی تو اون کے اس درد دل کا یہ عالم ہے کہ یہ حضرت ایسی منحوس گھڑی سے اس درد میں مبتلا ہوئے ہیں کہ پندرہ برس سے یہ کسی طرح کم ہی نہیں ہوتا ان کے درد کا دوسرا نام مضمون نگاری ہے۔
پس ان حضرت کی خطا یہ ہے کہ انھوں نے مضمون نگاری کا ایک ایسا حصہ اپنے ذمہ لے لیا جس کے ذریعے پڑھنے والوں کو ہنسایا جاتا ہے اور غم والم میں مبتلا مریضوں کو شفاء کامل دی جاتی ہے۔
مگر خود ان کا علاج یوں ہوا کہ جب تک مُلّا رموزی لطافت افروز مضمون نگاری کرتے رہے تو کمانے کی پابندیوں میں اس طرح جکڑے رہے کہ کامل دس برس انھیں دن کی روشنی دیکھنے کو نصیب نہ ہوئی اس سے اون پر درد دل کے شدید دورے پڑے اور وہ خاصے چیخے چلائے مگر اون کی غیرت مند قوم نے انکی ایک نہ سنی،
اس کے بعد مُلّا رموزی کا یہ درد دل جب اور زیادہ تکلیف دہ ہو گیا تو انھوں نے تالیف و تصنیف کا وہ دماغ سوز مشغلہ شروع کیا جس میں معاش و معاد کی فکروں سے کامل نجات حاصل ہونا شرط اول ہوتی ہے۔ مگر جیسے ہی کہ انھوں نے اپنی سب سے بلند اور سب سے

پہلی کتاب "عورت ذات" شائع کرنے کا ارادہ کیا تو اونکی آمدنی خطرہ میں گھر گئی۔ پھر جب انھوں نے اپنی دوسری کتاب "لاٹھی اور بھینس" تیار کی تو اون کے مضامین کے معاوضوں نے بھی انھیں جواب دیدیا کیوں کہ اب تالیف و تصنیف کرتے یا مختلف مضامین لکھتے ہیں اس درد سے وہ پھر چلائے تو اون کی بیدار۔ روشن خیال ایم اے پاس مگر زبان اردو کی دشمن قوم کے ہزاروں افراد میں سے چند آدمیوں نے اون کی دوا کے لیے جتنے دام دیے اوسے وہ اپنی کتاب "لاٹھی اور بھینس" میں چھاپ چکے۔

مگر اب بھی جو یہ درد کم نہ ہوا تو اونھوں نے پھر یہ مجموعہ بنا کیا . . . . فالحمد للہ علی کل حال۔۔

لیکن مجھے اگر یہ درد ملا تھا کہ میں اپنی مصیبتوں کی ماری ہوئی قوم کو اپنی لطیف و ظرایف تحریروں سے ہنسا کر جوان بناؤں میں اپنی تحریروں سے زبانِ اردو میں ادب لطیف اور تحریر کا

ایک شگفتہ اور جوان ذخیرہ جمع کر دوں تو اس کا لازمہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ میں کسی کی ملازمت نہ کروں کہ ایسا کرنے سے مجھے مضامین لکھنے کا وقت نہ ملیگا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا . . . .

. . . .

. . . . اس کے دوسرے معنیٰ یہ ہوئے کہ میں نے دانستہ طور پر ترک ملازمت کرکے اپنے بے گناہ دس متعلقین کو بھوک پیاس کے عذاب میں مبتلا کر دیا اور فخر کرتا ہوں اپنے ان جواں ہمت متعلقین کے صبر و حوصلہ پر کہ ان سب نے میری اس دیوانگی پر بھی مجھے کچھ نہ کہا مگر کیا میری ان قربانیوں کا یہ صلہ قوم کے ذمہ عائد نہ ہوتا تھا کہ وہ بھی اپنا سب کچھ میرے لیئے وقف کر دیتی مگر "کتاب عورت ذات" ایسی کتاب صرف عورتوں کے فائدے اور ان کے حق میں لکھی اور سنتا تھا کہ مرد کے مقابل عورت زیادہ نرم دل اور قدر دان ہوتی ہے مگر اس کتاب میں اپنی تمام مصیبتوں کو بیان کرکے جو درخواست کی تو صلہ یہ پایا کہ . . . .

.... اس کے بعد کتاب "زلزلا ٹھی اور بیٹیں بھی
عورتوں ہی کے لئے لکھی اور اس میں پہلے سے بھی زیادہ اپنی
مصیبتوں کو بیان کیا تو پہلا ہی نتیجہ یہ نکلا کہ یہ کتاب کل ہم (۱۴۴)
کی تعداد میں خریدی گئی مالی امداد کا تو ذکر کیا،
اور اب جو یہ کتاب لکھ رہا ہوں تو دل جانتا ہے کہ مالی مشکلات
کے کس ایمان آزما دور سے گذر رہا ہوں یعنی حد ہے کہ مہینہ بھر
اپنی کتابیں فروخت کرتا ہوں اور ان کی آمدنی جمع ہونیکے عوض
ماہوار گذارہ اور ذریعہ معاش بنجاتی ہے اور اگر ایک ذی مرتبہ
شاہی خاندان کی ہمدردی نہ ہوتی تو اس کتاب کا حوصلہ
بھی فنا ہو چکا تھا۔
بس ان حالات میں اب ایک ہی چیز رہ گئی ہے یعنی میں اس
سلسلہ کو یک لخت ترک کر دوں۔ ..... اور بس۔ مگر سن لیجئے
کہ جب تک یہ بات مانی جارہی ہے کہ عرش و فرش کا خدا ہر پستی
کو بلندی اور ہر کمزوری کو قوت بنا سکتا ہے اور یاس کو کامیاب

امید اس وقت تک میں حوصلہ نہ ہاروں گا اور محض آسی کی نوازش کی سہارے
کیونکہ آپ نے تو جو کچھ کیا اوسے میں نے اوپر کی سطروں میں ۔۔۔۔ دکھایا

. . . .

. . . .

. . . .

بھلا حد ہے اس اوندھی ذہنیت کی کہ آج ذاتی عقل و ایجاد تو ہندوستانیوں میں قسم کھانے کو بھی نہیں اب یورپ سے جو کچھ سیکھتے بھی ہیں تو وہ بھی اوندھا۔ مثلاً یورپ سے ہندوستانیوں نے ”مشاہیر پرستی“ سیکھی تو صرف اس طرح کہ ”دیوان غالب“ کو ہزار رنگ سے چھپوا کر اوس کی آمدنی خود کھا بیٹھے لیکن غالب کی قبر میں اس آمدنی سے نہ ایک سنگ مرمر لگایا نہ ایک اینٹ“

پھر غالب مرحوم کے کلام پر جتنے بڑے بڑے دماغوں نے مضامین لکھے اگر اون سے نصف بھی کسی زندہ شاعر اور ادیب کیلئے لکھے جاتے تو وہ زندہ ہونے کے باعث ان مضامین سے اور زیادہ پرجوش ہو کر کام کرتا۔ مگر وہ یہ سمجھتے ہی نہیں کہ زندہ لوگوں کا دل بڑھانا زیادہ مفید ہے یا مردہ بھائیوں کے

موجودہ ضروریات سے دور۔ کارناموں پر طویل مضامین لکھنا، بس اونھیں تو اتنا یاد ہے کہ "مشاہیر پرستی" ہر حال میں مستحسن ہے۔ یہی تو ہے کہ "اغلاط غالب" اور "متروکات غالب" حتیٰ کہ غالب کا نشان انگوٹھا بھی مل جائے تو بڑے بڑے رسالے اوسے رنگین صفحات میں جگہ دیں گے اور . . . . . .
ڈاکٹر اقبال دن میں دس دیوان لکھکر رکھدیں تو بس وہ ایک شیخ مبارک علی چھاپ کر فروخت کر دیں گے اور وہ بھی چار پانچ سال میں صرف ایک ایڈیشن۔

سب سے بڑی دماغی خوبصورتی تو یہ ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ تو یورپ زدہ ہوکر لنڈن اور پیرس میں جذب ہوگیا اوسے ملکی زبان اور ملکی ادب کے نام سے وحشت ہوتی ہے "تجارت پیشہ طبقہ تھا۔ جو اپنی دولتمندی سے ملکی ادبیات کو ترقی دے سکتا تھا مگر تجارت پیشہ طبقے میں علمی وادبی خدام کے لئے اتنی بھی جگہ نہیں کہ آج ملّا رموزی مثال ہی کے طور پر رنگون، بمبئی، کلکتے، دھلی، اور مدراس کے کسی سیٹھ صاحب کا تذکرہ کرتا۔

پس جب یہ حال ہو تو اب یہی رہ گیا ہے کہ ملّا رموزی مساجد کے اماموں اور یتیم خانے کے ناظموں سے درخواست کرے کہ خدارا آپ ملّا رموزی کی اتنی امداد فرمائیے کہ وہ . . . . مشکلات سے آزاد ہوکر

زبان اردو میں چند نادر نمونے جمع کر دے۔"

لیکن اگر یہ ہے کہ امرا اور رؤسا، تجار، خواتین، بیگمات، اور سرکاری افسروں میں اردو میں شگفتہ بنا دینے والے ذخیرۂ ادب سے ترقی کے نام پر کوئی فیاض جذبہ بیدار ہے تو وہ ملا رموزی کی امداد کریں اور وہ بھی کوئی یونیورسٹی اور کوئی عجائب خانہ تعمیر کرنے کے قابل نہیں بلکہ اوس کے "دائرہ ادب" کے لئے تاکہ وہ اس "مالی درد دل" سے سکون پائے۔ فقط

ملا رموزی، بھوپال،

معاونین محترم

میں نے اپنی کتاب "عورت ذات" اور "لاٹھی اور بھینس" میں
اپنے قدردان بہن بھائیوں سے درخواست کی تھی کہ اگر وہ میری قلمی
خدمات کے سلسلہ کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو وہ میرے "دائرہ ادب" کو
علاوہ فیاضانہ عطایا کے مستقل طور پر ایک روپیہ ماہوار فی کس کے
حساب سے بھی امداد عطا فرمائیں جس سے میرے گزارہ کے ایک سو روپیہ
ماہوار جمع ہوتے رہیں تو میں مزدوری کی لعنت سے آزاد ہو کر ملک و ملت
اور مذہب کی خدمت گزاری میں زیادہ سے زیادہ مستعدی کا اظہار
کر سکوں پس خدا کا احسان کہ جن خوددار، غیور، با مروت اور علم نواز
بہن بھائیوں نے میری اس درخواست کا صحیح اثر لیا ان کے علم و ادب
کی دنیا سے کبھی نہ مٹنے والے اسمائے گرامی مع تشریح امداد کے یہ ہیں

گرامی مرتبہ بیگمات اور رئیس زادیاں ....

گرامی مرتبہ علیا حضرت نواب زادی رضیہ سلطانہ بیگم بھٹاری
اسٹیٹ ۔ عہ ماہوار مستقل

گرامی مرتبہ محمد نسیم احمد صاحب صدیقی ناظر عدالت بھونگر ضلع حیدر آباد دکن
عہ روپیہ ماہوار مستقل

گرامی مرتبہ منشی راگھو وندر راؤ الا جذب وکیل عالم پور ضلع کرنول مدراس
عہ روپیہ ماہوار مستقل

گرامی مرتبہ پنڈت مادھو راؤ وکیل گدوال عہ روپیہ ماہوار مستقل

گرامی مرتبہ ڈاکٹر محمد حسین صاحب، عہ روپیہ ماہوار مستقل

گرامی مرتبہ سید ساجد علی بریلوی عہ روپیہ ماہوار مستقل

گرامی مرتبہ شاہزادہ فضل داد خاں صاحب صدر افغان کمیٹی ڈیرہ اسمٰعیل خاں ے روپیہ

گرامی مرتبہ ٹی۔ کرشنا شرما۔ وکیل کرنول صہ روپیہ

گرامی مرتبہ محمد عبدالستار صاحب رشید اکوڑہ چراٹ ضلع پشاور عا ر

گرامی مرتبہ بابو عبداللطیف صاحب عہ ر

گرامی مرتبہ شیخ عبدالعزیز صاحب کوتوال عا ر

گرامی مرتبہ چودھری محمد امین صاحب اوچل عا ر

گرامی مرتبہ سیٹھ اسمٰعیل صاحب اخوند جزیرہ ری یونین فرانس ۳۰ فرنک

یہ ہیں وہ قابل احترام و شکریہ بہن بھائی جنھوں نے ایک علمی

و ادبی خادم کی امداد کے جذبے سے یہ رقمیں عطا فرمائیں۔ خدا جزائے خیر دے
ان کے بعد جن بھائیوں نے میرے سی، پی، اور، برار کے دورہ میں مجھ کتابوں کے
خریدار بہم پہونچائے وہ یہ ہیں۔

گرامی مرتبہ ڈاکٹر اعظم کُریوی ایڈیٹر رسالہ اکبر الہ آباد ۲۰ خریدار
گرامی مرتبہ ماسٹر سید حفیظ الدین صاحب شوقی، بی، اے، برہانپور ۲۰ خریدار
گرامی مرتبہ بشیر احمد صاحب جالندھری انسپکٹر آف ورکس جی آئی پی ۲۰ خریدار
گرامی مرتبہ پروفیسر آغا حیدر حسن صاحب عابدی ایم، اے، امراؤتی برار ۲۰ خریدار

اب میری سابقہ درخواستیں ملاحظہ فرمایئے اور پھر ذرا سوچیئے کہ دس کروڑ
اردو سمجھنے والوں میں اور خصوصاً دولت مند طبقوں اور عورتوں ایسے
فیاض فطرت طبقات میں میری کتابیں خاصے لطف کے ساتھ سنی اور
سنائی گئیں سمجھی اور سمجھائی گئیں مگر مذکورہ بالا بہن بھائیوں کے سوا باقی کل
ناظرین اوسی طرح خموش رہے جس طرح کوئی گونگا آدمی کوئی بات سن تو
لیتا ہے مگر بول نہیں سکتا۔

پھر کب تک کہا جائے کہ جب تک دولت مند طبقہ اردو کے نام پر

آمادہ سرپرستی نہ ہوگا اوس وقت تک یہی ہوگا کہ ہم ایسے لوگ بتاتے رہیں گے
اور صاف صاف بتاتے رہیں گے کہ مسلمان کی دولت کو فلاں
فلاں قسم کے مصرف ہیں مگر وہ نہیں صرف کرتے تو علمی خدام پر
بہر کیف اب کہ میں نے محمود کو .... خدا کے
رحم و کرم گستر کے فضل پر چھوڑ دیا ہے اب بجز اسکے کوئی ذریعہ نہیں
کہ میں اپنے عالی حوصلہ ناظرین اور ناظرات سے پھر ایک مرتبہ کہوں
کہ وہ میرے اس سلسلۂ قلم کو جاری رکھنے کے لئے میری مستقل سرپرستی
فرمائیں جس کے لئے اب رقم کی مقدار اونہی کے حوصلہ پر چھوڑی جاتی ہے

وباللہ التوفیق

خزانۂ علم و لطافت

از ڈاکٹر عبدالحفیظ خان منشی فاضل

عورت ذات

"جلد اول"

زبانِ اردو میں مُلّا رموزی کی بہار افروز تحریروں کو جو رتبہ حاصل ہوچکا ہے اوس میں مُلّا رموزی کے قلم کی ندرت نگاری، جدت، اور اچھوتے طرزِ بیان کو خصوصیت حاصل ہے یہ کتاب خود مُلّا رموزی کے قول کے موافق اون کی تمام تحریروں کی جان ہے، اس کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ یہ تھکے ہوئے دماغوں سے، رنج و غم اور فکر و مایوسی کے مارے ہوئے قلوب کو نئے سر سے جوانی "زندگی" "خوشی" اور جوش بخشتی ہے۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ پورے ہندوستان کے ازدواجی "معاشرتی" رواجی، مذہبی، اور گھریلو حالات اور اخلاق کا ایک ایسا مکمل مجموعہ ہے جس میں وہ کچھ مل جاتا ہے جو اردو میں اس وقت تک نہیں، مثلاً اس میں یورپ کی بیوی

امریکہ کی بیوی، افریقہ کی بیوی، ایشیا کی بیوی، پھر ہندوستان کے کنجڑے کی بیوی، کسان بیوی، مزدور کی بیوی، بھٹیارے، دہوبی، حلوائی، مالی تیلی، تنبولی، جلاہے، اور مہاجن کی بیوی، رنڈی بیوی، تھیٹر اور سینما کی بیوی مشاطہ بیوی، منشی بیوی، عالم بیوی، فاضل بیوی، بیوہ بیوی اور اپنی بیوی کے جو تفصیلی حالات مُلّا رموزی نے اپنے رنگین قلم سے جس طرح لکھے ہیں اور اوس پر اردو کے سب سے بلند اور چوٹی کے اخباروں نے جو طویل تر تبصرے لکھے ہیں اون کے خلاصے ملاحظہ ہوں، چنانچہ

اخبار "بیدار لاہور مورخہ ۵ جولائی ۱۹۳۱ء | لکھتا ہے کہ یہ کتاب مُلّا رموزی کی خامہ براعت نگار کا نتیجہ بہترین ہے۔

اخبار "مدینہ بجنور مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۳۱ء | لکھتا ہے کہ عورتوں کے حالات پر اس کتاب سے زیادہ جامع اور سیر حاصل بحث کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتی"

اخبار "الجمعیتہ دہلی مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۱ء | ایک طویل تر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ملا رموزی کی تمام تحریروں میں یہ کتاب "حاصل کلام کا حکم رکھتی ہے"

اخبار "انقلاب لاہور مورخہ ۱۶ نومبر ۱۹۳۱ء | لکھتا ہے کہ میاں بیوی کے اتنے نازک موضوع پر اس کتاب کو ملا رموزی نے اس حیرت انگیز طریق پر لکھا ہے کہ اون کا

قلم کسی جگہ فحشیت پر مائل ہوا اور کوئی نہیں جو اسے شروع کر کے ختم کیے بغیر چھوڑ دے۔

غرض ان سے بھی سوا بلند رائیں ہیں جو اس کتاب کے متن میں حاصل ہو چکی ہیں پھر ظرافتِ علمی اور لطافت بیان کے جو نمونے اس میں ہیں اور کردار نویسی کے جو حیرت انگیز سلیقے اس میں دکھائے گئے ہیں انہیں خود ملاحظہ فرما کر اس بلند پایہ ادیب کو داد دیجیے (صفحات ساڑھے چار سو) قیمت غیر مجلد ہے مجلد للعہ محصول ڈاک ۷ر

عورت ذات جلد دوم

اس کتاب کا دوسرا حصہ اور انہی خوبیوں کا نمونہ جس میں رضاکار بیوی، یورپی بیوی، لیڈر بیوی، لیڈر کی بیوی، ایڈیٹر کی بیوی، ٹکٹ کلکٹر بیوی، ڈاکٹر بیوی، مسافر بیوی۔ اُستانی بیوی، لڑاکا بیوی، بزرگ بیوی وغیرہ یہ وہ بیویاں ہیں جن پر ہندوستان کی تمام اقسام کی بیویاں قریب قریب ختم ہو جاتی ہیں، ان میں خصوصیت سے 'یورپی بیوی' رضاکار بیوی، مسافر بیوی، اور اُستانی بیوی کے لئے ملا رموزی نے

جوز ورقلم صرف کیا ہے اوران کے حسن ورنگ پر جو فردوس نظر عبارتیں لکھی ہیں حق یہ ہے کہ وہ زبان اردو کی ترقی کا لاجواب نمونہ ہے پھر ان میں علمی اوراخلاقی تحقیق کے جو کمالات دکھائے ہیں اُن سے ملا رموزی ایک بلند مرتبہ محقق اور لطافت نگار کی صورت میں نظر آتے ہیں صفحات تقریباً (۲۵۰) قیمت تخمینی ۲؎

دیوان مُلّا رموزی

مُلّا رموزی کی تمام تحریری کائنات میں یہ بالکل ہی نئی چیز ہے۔ یعنی آج تک جن بھائیوں کو معلوم نہیں تھا کہ مُلّا رموزی نثر کی طرح نظم کہنے میں بھی ایک سب سے نرالے سلیقے کے مالک ہیں انہیں اس دیوانِ رنگ رنگ کو ضرور خریدنا چاہیئے۔ اس میں مُلّا رموزی صاحب کی عجیب وغریب نظمیں ہیں جو اسکولوں کے لڑکے، اسکولوں کے اوستاد، اسکولوں کے والد، اسکولوں کے بورڈنگ اور مسلمان غنڈوں کے عجیب عجیب عنوانوں سے لکھی گئی ہیں اور سارے ملک سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں، ان پر ایک ایک نظم حضرت جوش ملیح آبادی، اور حضرت مرم دار شاہ کی بھی اضافہ

کی گئی ہے، غرض ہنستے ہنستے پیٹ میں بل نہ پڑ جائے تو ہمارا ذمہ، قیمت صرف ۱۲/

زندگی

یہ ملّا رموزی کے اون ظریف و لطیف مضامین کا منتخب مجموعہ ہے جسے ادارۂ علمیہ حیدرآباد۔ دکن نے حال ہی میں شائع کیا ہے اس میں مختلف عنوانات کے تحت ملّا رموزی نے جو کچھ لکھا ہے وہ ماتم کدوں کو عشرت کدے بنانے والا ذخیرہ ہے، خصوصاً ملا رموزی کے سفر نامے ایک مستقل بہار ہیں جنہیں پڑھنے والے خزاں سے دوچار نہیں ہو سکتے"

صفحات تقریباً (۳۰۰) قیمت فی جلد عہ/

سوانح عمری ملّا رموزی

(بقلم خود)

بے شمار سوانح عمریوں میں سب سے اہم اور دلچسپ وہ سوانح عمریاں ہیں جنہیں خود صاحب سوانح نے اپنے قلم سے لکھا ہے لیکن ملا رموزی نے اپنی پیدائش سے لیکر موت کے حالات مع جنازے اور مزار کے اپنی زندگی میں

اپنے ہی قلم سے جس عجیب و غریب انداز سے لکھے ہیں آج تک اگر اس رنگ کی
کوئی ایک سوانح عمری بھی اردو میں بتا دی جائے تو یہ کتاب مفت
نذر کیجائے گی، اصل میں یہ ملا رموزی کی اوس ہنگامہ خیز سوانح عمری کا ضمیمہ
ہے جسے وہ اپنی واقعی موت کے بعد چھپوانے کی تکمیل کر چکے ہیں اور یہ اسلئے
کہ اس اصل سوانح عمری میں موصوف کے دوستوں حاسدوں اور مخالفوں
کی ایسی ایسی کیفیات کھول کھول کر بیان کی گئی ہیں جنہیں دیکھ کر دنیا حیران
رہ جائیگی کہ اردو کے اتنے نامور ادیب کے ساتھ کیسے کیسے مظالم روا
رکھے گئے مگر اوس کے صبر و استقلال نے اپنی زندگی میں یہ کبھی گوارا نہ کیا کہ
اوسکے دوست اوس کی آنکھوں کے سامنے ذلیل ہوں پس اگر ایک بالکل
ہی نئے قسم کی تحریر اور سوانح عمری دیکھنا ہو جس میں خود سوانح عمری والے
نے اپنے قلم سے اپنے جنازے اور مزار تک کے حالات لکھے ہوں
تو صرف ساڑھے چار آنے کے ٹکٹ بھیجکر یہ سوانح عمری طلب کیجیے۔

لاٹھی اور بھینس

یہ تازہ ترین کتاب ہنسی، خوشی کا البم اور غم والم دور کرنے اور
حکمت وفوائد کا لاجواب نمونہ ہے، اس میں مُلّا رموزی نے اپنی بھینس کے
جو حد سے سوا ہنسانے والے حالات لکھے ہیں اون میں اس زمانے کی
ماؤں لڑکیوں اور فیشن ایبل عورتوں کی، معاشرت و اخلاق کے عجیب
عجیب واقعات جس عجیب انداز میں لکھے ہیں اون کا تقاضہ ہے کہ یہ
کتاب ہر گھر میں رہے، اس کی ہنسی پیدا کرنے والی اور غم سے دور رکھنے
والی خوبی اس خیال سے معلوم ہو سکتی ہے کہ جب ایک ظریف ادیب بھینس
ایسے جانور پر ایک پوری کتاب لکھے گا تو کیا کچھ نہ لکھا ہوگا صفحات (۲۱۱)
قیمت ایک روپیہ چار آنہ علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ۔ مُلّا رموزی بھوپال

کشیدہ کاڑھنی کی مشین

بیگمات کے لیئے نہایت کار آمد تحفہ ہے۔ اس مشین سے تھوڑی ہی عرصہ میں اور ذرا سی محنت سے نہایت خوبصورت اونی ریشمی کشیدہ کاری بہت بڑھیا اور پائدار بنائی جا سکتی ہے۔ بانات، مخمل، کھدر، لٹھا اور دیگر ہر قسم کے موٹے کپڑوں پر اعلیٰ درجے کے نقش و نگار بیل بوٹے، پھول وغیرہ نہایت آسانی سے بن سکتے ہیں۔ تکیوں کے غلاف، بچوں کی ٹوپیاں، مخمل کی گرگابیاں۔ سلیپر۔ ٹیبل کلاتھ، جھالریں، غرض ہر چیز پر ہر قسم کی گلکاری لاجواب طریقے سے نہایت جلدی اور بالکل ہی تھوڑی دیر میں بنائی جا سکتی ہے۔

ترکیب استعمال۔ نہایت آسان ہے۔ ایک مشین ضرور منگا دیں۔ بڑے کام کی چیز ہے قیمت قسم خاص ہے۔ قسم اول ؏

—: منگوانے کا پتہ :—

دی ونڈرس ہاؤس۔ قصور۔ (پنجاب)

انٹی سفلس پلز

مرض آتشک (گرمی) کا بہترین علاج انجکشن ہے۔ مگر ہندوستان میں اس قدر مفلسی پھیل گئی ہے کہ انجکشن کے مصارف برداشت کرنا ایک غریب آدمی کیلئے نہایت مشکل ہے۔ اور مرض آتشک بھی ہندوستان میں مکڑی کے جالے کی طرح پھیل چکا ہے۔ اس مرض کی ہزاروں بلکہ لاکھوں دوائیں ہیں مگر جب روز سے انٹی سفلس پلز ایجاد ہوئی ہے ہر شخص ان کو استعمال کر کے صرف سات روز میں صحت کلی حاصل کر رہا ہے۔ یہ مرض آتشک کو جڑ سے اکھاڑ دیتی ہیں صرف سات روز یہ گولیاں کھانے سے آتشک کے زخموں کے نشان تک مٹ جاتے ہیں۔

ترکیب۔ ۲ گولی صبح ۲ گولی دوپہر ۲ گولی شام ہمراہ پانی کھانا چاہئیے۔

طلائے ملذذ و فیروزی

یہ طلا لذت اور سرور بخشتا ہے بوقت ضرورت تھوڑا روغن زعفرانی میں ملا کر طلا کریں اور کچھ عرصہ بعد کپڑے سے صاف کر کے مشغول ہوں اسکی تعریف تہذیب کے دائرہ سے خارج ہے۔ قیمت ہر دو دوا طلائے ملذذ و روغن زعفرانی ۶ روپیہ۔ منیجر سلطانیہ میڈیکل اسٹورس بھوپال

گولڈن پلز

نامردی کی بیش بہا گولیاں ہیں ان کے استعمال سے تمام زائل شدہ قوتیں از سرِ نو تازہ ہو جاتی ہیں پہلی ہی خوراک اپنا جادو نما اثر دکھاتی ہے ان کے استعمال سے قوت رجولیت میں اس قدر زیادتی ہو جاتی ہے کہ انسان بے چین ہو جاتا ہے۔ ہزاروں مادرزاد نامرد بھی ان کے استعمال سے مرد بن گئے ہیں ان کی جسقدر تعریف کیجائے کم ہے۔ یہ گولیاں نوابوں، رئیسوں، اور شوقینوں کی جان ہیں ان گولیوں کا استعمال صرف شادی شدہ اشخاص ہی کریں۔ قیمت ۲۴ گولی ۸؍
۵۰ گولی عہ؍ ۱۰۰ گولی للعہ؍

وٹو

ہنگریا نیز سوزاک اور آتشک سے محفوظ رہنے کے لئے یہ دوا ایجاد کی ہے اس دوا کو قبل اور بعد عضوِ مخصوص پر لگا کر بیمار سے بیمار عورت کے ساتھ ہم صحبت ہونے پر بھی مرد کو کوئی بیماری نہیں ہوتی لاکھوں اس دوا کو استعمال کر رہے ہیں بہت مفید ثابت ہو رہی ہے عیاشوں کی جان ہے قیمت ۲؍

پتہ: منیجر سلطانیہ میڈیکل اسٹورس بھوپال

طلائے فیروزی

اکثر لوگ ۔۔۔۔۔ عیاشی میں مبتلا ہوکر اپنی زندگی کو بیکار کر لیتے ہیں عضو ۔۔۔۔ کی رگیں
پھول جاتی ہیں بدن میں سستی آجاتی ہے مرد عورت کے کام کا نہیں رہتا یعنی نامرد ہو جاتا
ہے ان تمام باتوں کے دور کرنیکے لیئے کیمیاوی اصول کے ماتحت یہ طلاء تیار کیا گیا ہے یہ طلاء
اُن لوگوں کے لیئے جو جوانی کی غلط کاریوں سے اپنے آپ کو تباہ و برباد کر چکے ہوں انجیانے
رگوں او رپٹھوں کی جملہ خرابیوں کو رفع کر کے پوری قوت پہونچاتا ہے ہزاروں نامردوں کو مرد
بنا چکا ہے اس کے استعمال میں کسی موسم کی قید نہیں ہے کوئی اور بدبودار دوا اسمیں شامل
نہیں کی گئی ہے پھر لطف یہ ہے کہ بالکل بے ضرر ہے اُپاڑ کرتا ہے نہ سوزش نہ چھپکی پیدا ہوتی
ہے۔ طریق استعمال :۔ وقت شب سیون چھوڑ کر استعمال (یعنی مالش) کر کے گرم پان پیچے
دہاگے سے باندہ لیں ۲۰ روز تک استعمال کریں۔ اگر تیسرے چوتھے روز خفیف سے دانے نکل
آئیں تو طلاء کا استعمال ملتوی کر کے صبح شام گھی جلا کر لگائیں آرام ہونے پر پھر طلاء کا استعمال شروع
کریں انشاء اللہ ۲۰ روز کے استعمال سے اعضاء کی تمام خرابی سستی اور کمزوری دور ہو کر از سر نو
طاقت مردانگی و برانگیختگی پیدا ہو جائیگی قیمت فی شیشی جو ۲۰ یوم کے لئے کافی ہوگی ۶عہ

پتہ: منیجر سلطانیہ میڈیکل اسٹورس بھوپال

مقبول ٹانک پلز

طاقت کی بہترین دوا

یہ گولیاں حلق سے اترتے ہی تمام مردہ قوتوں کو زسرِنو زندہ کر دیتی ہیں کمزور ناتواں مریض کو طاقتور و توانا بنا دیتی ہیں۔ اعصاب پر بجلی کی طرح اثر کرتی ہیں۔ جریان سرعت...... کمزوری نامردی ضعف باہ ہاتھ پاؤں میں رعشہ۔ اختلاجِ قلب ضعف حافظہ جوانی میں بڈھوں کی سی حالت یہ تمام شکایات بالکل رفع ہو جاتی ہیں نیز کمزور جسم توانا ہو جاتا ہے زور آور ہو جاتی ہے طبیعت بشاش ہاضمہ درست ہو جاتا ہے۔ جسم میں سرخ خون پیدا ہوتا ہے تندرست احباب ان گولیوں کو استعمال کر کے بے پناہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں اس کے استعمال سے اس غضب کی تحریک پیدا ہوتی ہے کہ طبیعت بے چین ہو جاتی ہے یہ گولیاں تمام زائل شدہ قوتوں کو واپس لا کر از سرِ نو جوانی سے کہیں زیادہ قوت پیدا کر دیتی ہے۔ اس قدر فوائد کے باوجود رفاہِ عام کی غرض سے بہت کم قیمت رکھی ہے تاکہ ہر شخص لطف اندوز ہو سکے۔

ترکیب استعمال:۔ دو گولی صبح ۲ گولی دوپہر ۲ گولی شام بعد غذا کھانا چاہیئے دوران استعمال میں دودھ گھی کا خوب استعمال کیا جائے قیمت فی شیشی [illegible] مہتمم سلطانیہ میڈیکل اسٹورز [illegible]

تصنیفاتِ مُلّا رموزی

نمبر	نام کتاب	قیمت	موضوع
۱	سوانح مُلّا رموزی	سہر	اس میں مُلّا رموزی صاحب نے اپنے سوانح زندگی کے حالات کو پیدائش سے لیکر انتقال تک خود ہی لکھا ہے' بے حد عجیب وغریب سوانح عمری
۲	انتخاب گلابی اُردو	۸ر	یہ وہ مقبول نثر اور انوکھا طرز تحریر ہے جس میں سیاست و نکتہ چینی کے پیالے کا نشہ اور آتش ریز مضامین جمع کیے گئے ہیں اور جو ہندوستان کے تمام طبقات سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔
۳	مقالات گلابی اُردو	۱۲ر	حصہ دوم
۴	خواتین انگورہ	عہر	مصطفیٰ کمال پاشا کے ساتھ جنگ ترکی و یونان میں جن عورتوں نے شرکت کی اور انتظامِ حکومت میں حصہ لیا اُن کے تفصیلی اور مستند حالات، نہایت تاریخی اور متین کتاب،
۵	نکاتِ رموزی باتصویر	عہر	اس میں مُلّا صاحب کے دوسرے ایجاد کردہ طرز تحریر یعنی سادہ اور مروجہ اُردو کے مضامین ہیں جن میں فصاحت اور ظرافت کے دلنواز نمونے، اپنی لاجوابی و بے مثالی کی

تصنیفات مُلّا رموزی

نمبر	نام کتاب	قیمت	موضوع
			داد تمام ادبی طبقوں سے حاصل کر چکے ہیں، اس میں ملا صاحب کی تصویر بھی ہے۔
۶	لکاتِ رموزی	عہ	حصۂ دوم
۷	صبح لطافت	عار	اگر ظرافت و زندہ دلی اور سیاسی نکتہ چینی کے نمونے دیکھنا ہوں تو اس کتاب کو دیکھیے حصہ سوم
۸	زندگی	عار	ادبِ عالی، صحت نگارش، کردار نگاری، اور ظرافت کا دریا موج پر
۹	شادی	عار	مُلّا رموزی صاحب کی شادی کے تمام تفصیلی حالات جنہیں خود مُلّا صاحب نے اپنے لطافت بار قلم سے لکھے ہیں۔ جاہلانہ رسوم کی اصلاح اور طنز نگاری کا لاجواب خزانہ
۱۰	عورت ذات	عہ	یہ کتاب ملا رموزی کی سب سے بلند علمی کتاب ہے جس میں وسعت معلومات کا ایک دریا ہے، یورپ، امریکہ، افریقہ، ایشیا، اور ہندوستان کی ازدواجی زندگی کی ایک ایسی انسائیکلوپیڈیا ہے کہ ہنسی ہنسی میں بے شمار میاں بیوی کے حالاتِ زندگی معلوم کر لیجیے۔

تصنیفات مُلّا رموزی

نمبر	نام کتاب	قیمت	موضوع
	لاٹھی اور بھینس	عہر	ظرافت اور کمالِ انشا پردازی کا جیتا جاگتا نمونہ یعنی بھینس جیسے جانور پر پورے ڈیڑھ سو صفحات کا بے شمار فائدہ رنگ میں لکھ دیا جانا کمالِ قلم ہے بظاہر ایک فسانۂ ظرافت لیکن عورتوں کی اصلاح کا ایک قابلِ احترام سبق بھی
	دیوانِ مُلّا رموزی	سہر	اسکولوں کالجوں اور عام نوجوانوں کی فیشن ایبل ا فیشن پرست زندگی کی اصلاح پر مُلّا رموزی کی وہ ظر اور رہنمائی والی نظمیں ہیں جن میں ماسٹروں اور پروفیسروں کو بھی رگیدا گیا ہے۔

ملنے کا پتہ:- مُلّا رموزی۔ بھوپال

